رمضان المبارک ۱۴۳۲ھ

اگست ۲۰۱۱ء

ماہنامہ

# میثاق

لاہور

یکے از مطبوعات

تنظیم اسلامی

بانی: ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ علیہ

## روزہ

آفاقیت، احکام، فضائل اور جدید فقہی مسائل

☆

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کا تفسیری منہج

ڈاکٹر سید سلمان ندوی

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!


جلد : 60

شمارہ : 8

رمضان المبارک 1432ھ

اگست 2011ء

فی شمارہ 25/-

اس شمارے کی قیمت 50 روپے


# ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائی ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ


مدیر

حافظ عاکف سعید

نائب مدیر

حافظ خالد محمود خضر



سالانہ زرِ تعاون

| | |
|---|---|
| اندرون ملک | 250 روپے |
| بھارت و بنگلہ دیش | 900 روپے |
| ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ | 1200 روپے |
| امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ | 1500 روپے |

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700 ' فون: 3-35869501

فیکس: 35834000 ای میل: publications@tanzeem.org

ویب سائٹ ایڈریس: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔ علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو لاہور

فون: 36366638 - 36316638 فیکس: 36271241

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

# مشمولات


✿ **عرضِ احوال** ——— 3
اسلام: بنگلہ دیش کا سرکاری مذہب — ایوب بیگ مرزا

✿ **بیانُ القُرآن** ——— 5
سورۃ الاعراف (آیات ۳۲ تا ۵۸) — ڈاکٹر اسرار احمد

✿ **شهرِ عظیم** ——— 25
☆ روزہ: آفاقیت، احکام، فضائل اور جدید فقہی مسائل — حافظ محمد زاہد
☆ روزہ میں آسانیاں — حافظ محمد مشتاق ربانی — 46
☆ آخری عشرہ: دوزخ سے نجات — حافظ محمد ادریس — 51

✿ **اُسوہ و سیرت** ——— 54
اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ — عتیق الرحمٰن صدیقی

✿ **یادِ رهبر** ——— 61
ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کا تفسیری منہج — ڈاکٹر سید سلمان ندوی

✿ **قندِ مکرر** ——— 77
تاریخ کی قرآنی تعبیر — سراج منیر (مرحوم)

✿ **دعوت و تحریک** ——— 87
تحریکوں میں جلد بازی کی ذہنیت — سید قطب شہیدؒ

✿ **دعوتِ فکر** ——— 98
انسان کا مقصدِ حیات: ترقی یا نجات؟ — محمد عمران صدیقی

✿ **حسنِ معاشرت** ——— 107
☆ ہندومت اور اسلام میں عورت کے پردے کا موازنہ — ڈاکٹر گوہر مشتاق
☆ نکاح کی ضرورت واہمیت — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ — 121

✿ **تعلیم و تعلّم** ——— 125
نحو وصرف کی صحیح اور جامع تدریس کے اصول — محمد بشیر

✿ **مسائلِ تصوّف** ——— 135
مسئلہ وحدت الوجود کی پیچیدہ گتھی — مولانا اشرف علی تھانوی

✿ **خواب اور تعبیر** ——— 139
مبشرات اور علمِ غیب — ڈاکٹر ایم اے اقبال

✿ **روحانی علاج** ——— 151
جادو اور آسیب کا علاج — حافظ محمد زبیر





داخلے جاری ہیں

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیرِ اہتمام

## رجوع الی القرآن کورسز (پارٹ I اور II)

یہ کورسز بنیادی طور پر تعلیم یافتہ افراد کے لیے ترتیب دیے گئے ہیں' تاکہ وہ حضرات جو کم از کم انٹرمیڈیٹ کی سطح تک اپنی دنیاوی تعلیم مکمل کر چکے ہوں اور اب بنیادی دینی تعلیم بالخصوص عربی زبان سیکھ کر فہم قرآن کے حصول کے خواہش مند ہوں' ان کورسز کے ذریعے ان کو ایک ٹھوس بنیاد فراہم کر دی جائے۔ ہفتے میں پانچ دن روزانہ صبح کے اوقات میں تقریباً پانچ گھنٹے تدریس ہوگی۔ ہفتہ وار تعطیل ہفتہ اور اتوار کو ہوگی۔

**نصاب (پارٹ I)**

1. عربی صرف ونحو
2. ترجمہ قرآن
3. آیاتِ قرآنی کی صرفی ونحوی تحلیل
4. قرآن حکیم کی فکری وعملی راہنمائی
5. تجوید و ناظرہ
6. مطالعۂ حدیث و فقہ العبادات
7. اصطلاحاتِ حدیث
8. اضافی محاضرات

**نصاب (پارٹ II)**

1. مکمل ترجمۃ القرآن (مع تفسیری توضیحات)
2. مجموعۂ حدیث
3. فقہ
4. اصولِ تفسیر
5. اصولِ حدیث
6. اصولِ فقہ
7. عقیدہ
8. عربی زبان وادب
9. اضافی محاضرات

- اس سال کلاسز کا آغاز 12 ستمبر سے ہوگا
- داخلہ کے خواہشمند خواتین و حضرات 12 ستمبر کو صبح ساڑھے آٹھ بجے انٹرویو کے لیے قرآن اکیڈمی تشریف لائیں
- پارٹ II میں خواتین کی شرکت کا انتظام نہیں ہے

**نوٹ:** پارٹ I میں داخلے کے لیے انٹرمیڈیٹ پاس ہونا اور پارٹ II میں داخلے کے لیے رجوع الی القرآن کورس (پارٹ I) پاس کرنا لازمی ہے

برائے رابطہ: **قرآن اکیڈمی**
36-K ماڈل ٹاؤن لاہور
فون: 35869501-3
email:irts@tanzeem.org
ندیم سہیل
0322-4371473
0312-4140589

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# اسلام: بنگلہ دیش کا سرکاری مذہب

بنگلہ دیش میں اسلام کو سرکاری مذہب قرار دے دیا گیا ہے' اور یہ کسی فوجی آمر یا سول بیوروکریٹ نے بیک جنبش قلم نہیں کیا' بلکہ زبردست عوامی مطالبے پر بنگلہ دیش کی قومی اسمبلی نے یہ فیصلہ ایک ووٹ کے مقابلے میں ۲۹۱ ووٹوں کی بھاری اکثریت سے کیا' حالانکہ آئینی ترمیم کے لیے صرف دو تہائی ووٹوں کی ضرورت تھی۔ یعنی اس ترمیم کو اسمبلی کے اندر اور باہر مکمل عوامی حمایت حاصل تھی۔

پاکستان سے علیحدگی کے بعد ۱۹۷۲ء میں بنگلہ دیش کو جو آئین اُس کے فادر آف دی نیشن شیخ مجیب الرحمٰن نے دیا تھا اُس میں خاص طور پر اسلام سے لاتعلقی کا اظہار تھا اور فخریہ انداز میں اُسے ایک سیکولر ملک کا سیکولر آئین قرار دیا گیا تھا۔ آج اُسی شیخ مجیب الرحمٰن کی بیٹی وزیراعظم حسینہ واجد عوامی مطالبے پر اسلام کو ملک کا سرکاری مذہب قرار دینے پر مجبور ہوئی ہیں۔ متحدہ پاکستان کی سیاسی و عسکری قیادت کی ناعاقبت اندیش پالیسیوں اور اقتدار کی ہوس نے جب وطن عزیز کو دولخت کر دیا تو مغربی پاکستان کے محبِّ وطن عناصر کو اگرچہ ہندو کے ہاتھوں ذلت آمیز شکست کا صدمہ بھی تھا' اُنہیں بنگالی بھائیوں کی علیحدگی کا بھی دُکھ تھا' اُنہیں غیروں کی سازشوں سے زیادہ اپنوں کی لالچ اور حماقتوں کا غم بھی تھا' لیکن اُنہیں سب سے زیادہ دُکھ اس بات پر تھا کہ اُس وقت کی بنگالی قیادت نے پاکستان کے ساتھ ساتھ اسلام سے بھی اعلانِ براءت کر دیا تھا۔ اسی لیے تو اندرا گاندھی کو یہ کہنے کی جرأت ہوئی تھی کہ ہم نے نظریۂ پاکستان کو خلیج بنگال میں غرق کر دیا ہے۔ یہ جملہ اسلام اور پاکستان سے محبت کرنے والوں کے سینہ میں تیر کی طرح پیوست ہو گیا۔ آج اہل بنگلہ دیش نے ہمارے سینے سے یہ تیر نکال کر کمین گاہ کی طرف واپس فائر کر دیا ہے' جو ٹھیک نشانہ پر لگا اور بھارت کا وزیراعظم یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوا کہ بنگلہ دیش میں بھارت کے خلاف نفرت بڑھ رہی ہے۔ اگرچہ اہل بنگلہ دیش نے یہ تیر بھارت کی طرف روانہ کیا تھا لیکن اس سے پاکستان کے سیکولر عناصر زیادہ بُری طرح گھائل ہوئے ہیں۔ وہ جنہیں بھارت کی طرف سے محبت کے زمزمے بہتے دکھائی دیتے



ہیں' وہ جو امن کی آشا کا یکطرفہ ٹریفک چلائے جا رہے ہیں' وہ جو بالی وڈ کا نام لے کر آہیں بھرتے ہیں' اور وہ جو دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت اور وہاں کے سیکولرازم سے دیوانہ وار محبت کرتے ہیں۔ وہ جو پاکستان کے نام کے ساتھ اسلامی کے لفظ کو مٹانے کے لیے خود مر مٹنے کو تیار تھے' بنگلہ دیش کے نام کے ساتھ بھی اسلامی کے لاحقے نے ان کی امیدوں پر پانی پھیر دیا ہے۔

اگرچہ بنگلہ دیش نے فی الحال اسلام کو محض اپنے ملک کا سرکاری مذہب قرار دیا ہے اور اسلامی فلاحی ریاست بننے کی طرف کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا' لیکن اگر موجودہ عالمی خصوصاً خطہ کے حالات کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہ ایک بہت بڑا یوٹرن ہے۔ امریکا افغانستان سے دُم دبا کر بھاگ رہا ہے۔ امریکی شکست اور پسپائی کے بعد بھارت نہ صرف افغانستان میں اپنا کوئی مستقبل نہیں دیکھ رہا بلکہ طالبان پاکستان کراس کر کے اُسے بھارت میں داخل ہوتے نظر آتے ہیں۔ بھارتی قیادت آج کل جس طرح کے بیانات دے رہی ہے' معلوم ہوتا ہے راتوں کو خواب میں بھی طالبان اُن کا تعاقب کر رہے ہیں' لہٰذا اُنہیں اچانک پاکستان کا استحکام عزیز ہو گیا ہے۔ بدقسمتی سے پاکستان میں اسلامی قوتیں اگرچہ ابھی منتشر ہیں اور انتخابی سیاست کی چاٹ اُنہیں متحد اور مضبوط نہیں ہونے دے رہی' لیکن حکمرانوں کی اندھا دھند لوٹ مار اور عوام کی انتہائی بری حالت بالآخر انہیں مجبور کر دے گی کہ وہ انتخابی سیاست کی جان چھوڑ کر متحد ہو کر ایک انقلاب کے لیے عوام کو موبلائز کریں اور سٹریٹ پاور سے موجودہ سیکولر حکمرانوں کو مجبور کر دیں کہ یا تو وہ اسلام کا نظامِ عدلِ اجتماعی ملک میں نافذ کریں یا اقتدار چھوڑ دیں۔

پاکستان اس وقت ایک دوراہے پر کھڑا ہے۔ سیکولر قوتیں اسلام دشمن عالمی قوتوں سے گٹھ جوڑ کر کے پاکستان سے اسلام کا نام و نشان مٹانا چاہتی ہیں۔ ان کے مقابلے میں اسلامی قوتیں منتشر اور بکھری ہوئی ہیں۔ لیکن قدرت کو شاید کچھ اور منظور ہے۔ عوامی سطح پر نوجوانوں کا رخ بڑی تیزی سے اسلام کی طرف ہو رہا ہے۔ امیر و کبیر اور دُنیوی وجاہت رکھنے والے گھرانوں میں اگر کچھ لوگ بے حیائی اور برائی کی طرف رخ کیے ہوئے ہیں تو انہی گھرانوں میں ایک کثیر تعداد' جو زیادہ تر نوجوانوں پر مشتمل ہے' دین و مذہب کو شعوری طور پر سمجھنے اور اپنانے کی طرف راغب ہے۔ لہٰذا اِس وقت پاکستان میں دونوں قوتوں کے مابین زبردست رسّہ کشی چل رہی ہے۔ زیادہ انحصار خاموش اکثریت پر ہے' وہ فیصلہ کن ثابت ہو سکتی ہے۔ امریکہ کے عراق و افغانستان میں مظالم اور طالبان کا معجزاتی طور پر امریکہ کا مقابلہ کرنا' اس سے خاموش اکثریت کا وزن اسلامی قوتوں کے پلڑے میں پڑنے کے واضح امکانات ہیں۔ ہمیں یقین واثق ہے کہ

(باقی صفحہ 124 پر)

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

# سُورۃُ الاعْرَاف

## آیات ۳۲ تا ۳۹

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ۭ قُلْ
هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ
الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا
بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا
وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَي اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۚ فَاِذَا جَاۗءَ
اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ۝ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ
رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ۙ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ
عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ اُولٰۗىِٕكَ
اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَي اللّٰهِ
كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ۭ اُولٰۗىِٕكَ يَنَالُهُمْ نَصِيْبُهُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ ۭ حَتّٰٓى اِذَا
جَاۗءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ ۙ قَالُوْٓا اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ
قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا وَشَهِدُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ۝ قَالَ ادْخُلُوْا
فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ فِي النَّارِ ۭ كُلَّمَا دَخَلَتْ
اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا ۭ حَتّٰٓى اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا ۙ قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ



لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰٓؤُلَاۗءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ۭ قَالَ لِكُلٍّ
ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ ۝ وَقَالَتْ اُوْلٰىهُمْ لِاُخْرٰىهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ
عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ۝

**آیت ۳۲** ﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ۭ قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ﴾ ''(اے نبی ﷺ! ان سے) کہیں کہ کس نے حرام کی ہے وہ زینت جو اللہ نے نکالی ہے اپنے بندوں کے لیے؟ اور (کس نے حرام کی ہیں) پاکیزہ چیزیں کھانے کی؟ آپ کہہ دیجیے یہ تمام چیزیں دنیا کی زندگی میں بھی اہلِ ایمان کے لیے ہیں اور قیامت کے دن تو یہ خالصتاً ان ہی کے لیے ہوں گی۔''

دُنیا میں رہتے ہوئے تو بے شک اللہ کے منکرین بھی اس کی نعمتوں میں سے کھا پی لیں' استفادہ کرلیں مگر آخرت میں یہ تمام پاکیزہ چیزیں اور نعمتیں اہلِ ایمان اور اہلِ جنت کے لیے مختص ہوں گی اور کفار کو ان میں سے کوئی چیز نہیں ملے گی۔

﴿كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝﴾ ''اسی طرح ہم اپنی آیات کی وضاحت کرتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں۔''

**آیت ۳۳** ﴿قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ﴾ ''کہہ دیجیے کہ میرے ربّ نے تو حرام قرار دیا ہے بے حیائی کی باتوں کو خواہ وہ اعلانیہ ہوں اور خواہ چھپی ہوئی ہوں''

بے حیائی خواہ چھپی ہوئی بھی ہو' اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں ہے۔

﴿وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ﴾ ''اور (حرام کیا ہے اُس نے) گناہ کو اور ناحق زیادتی کو''

﴿وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَي اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝﴾ ''اور یہ (بھی حرام ٹھہرایا ہے) کہ تم اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراؤ (کسی ایسی چیز کو) جس کے لیے اس نے کوئی سند نہیں اتاری ہے اور یہ بھی کہ تم اللہ کی طرف

منسوب کرو وہ چیز جس کا تم علم نہیں رکھتے۔''

**آیت ۳۴** ﴿وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۚ﴾ ''اور ہر قوم کے لیے ایک وقت معیّن ہے۔''

یعنی جب بھی کبھی کسی قوم کی طرف کوئی رسول آتا' تو ایک مقررہ مدّت تک اس قوم کو مہلت میسّر ہوتی کہ وہ اس مدتِ مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے رسولؑ کی دعوت پر لبیک کہے اور صحیح راستے پر آ جائے۔ اس مقررہ مدت کے دوران اس قوم کی نافرمانیوں کو نظر انداز کیا جاتا اور اُن پر عذاب نہیں آتا تھا۔ حضور ﷺ کی بعثت کے بعد مکہ میں بھی یہی معاملہ درپیش تھا۔ اہلِ مکہ کو مشیتِ خداوندی کے تحت مہلت دی جا رہی تھی۔ دوسری طرف حق و باطل کی تھکا دینے والی کشمکش میں اہلِ ایمان کی خواہش تھی کہ کفار کا فیصلہ جلد از جلد چکا دیا جائے۔ اہلِ ایمان کے ذہنوں میں لازماً یہ سوال بار بار آتا تھا کہ آخر کفار کو اس قدر ڈھیل کیوں دی جا رہی ہے! اس پس منظر میں اس فرمان کا مفہوم یہ ہے کہ اہلِ ایمان کا خیال اپنی جگہ درست سہی' لیکن ہماری حکمت کا تقاضا کچھ اور ہے۔ ہم نے اپنے رسول (ﷺ) کو مبعوث فرمایا ہے تو ساتھ ہی اس قوم کے لیے مہلت کی ایک خاص مدت بھی مقرر کی ہے۔ اس مقررہ گھڑی سے پہلے ان پر عذاب نہیں آئے گا۔ ہاں جب وہ گھڑی (اجل) آ جائے گی تو پھر ہمارا فیصلہ مؤخر نہیں ہوگا۔ سورۃ الانعام کی آیت ۵۸ میں اسی حوالے سے فرمایا گیا کہ اے نبی (ﷺ) آپ کفار پر واضح کر دیں کہ اگر میرے اختیار میں وہ چیز ہوتی جس کی تم لوگ جلدی مچا رہے ہو تو میرے اور تمہارے درمیان یہ فیصلہ کب کا چکایا جا چکا ہوتا۔

﴿فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۳۴﴾﴾ ''پھر جب اُن کا وہ مقرّرہ وقت آ جائے گا تو نہ ایک گھڑی پیچھے ہٹ سکیں گے' نہ آگے کی طرف سرک سکیں گے۔''

اب وہ بات آ رہی ہے جو ہم سورۃ البقرۃ میں بھی پڑھ آئے ہیں۔ وہاں آدم علیہ السلام کو زمین پر بھیجتے ہوئے فرمایا گیا تھا: ﴿فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۹﴾﴾۔ اسی بات کو یہاں ایک دوسرے انداز سے بیان کیا گیا ہے۔

**آیت ۳۵** ﴿يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ۙ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۵﴾﴾ ''اے بنی آدم! جب بھی



تمہارے پاس آئیں رسول تم ہی میں سے جو تمہیں میری آیات سنائیں' تو جو کوئی بھی (ان کی دعوت کے جواب میں) تقویٰ کی روش اختیار کرے گا اور اصلاح کر لے گا تو ان کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ کسی غم سے دوچار ہوں گے۔''

**آیت ۳۶** ﴿وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۶﴾﴾ ''اور جو ہماری آیات کو جھٹلائیں گے اور تکبّر کی بنا پر انہیں رد کر دیں گے وہی جہنمی ہوں گے' اسی میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔''

**آیت ۳۷** ﴿فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ۭ﴾ ''پھر اُس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ کی طرف کوئی غلط بات منسوب کرے یا اُس کی آیات کو جھٹلائے۔''

﴿اُولٰٓئِكَ يَنَالُهُمْ نَصِيْبُهُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ ۭ﴾ ''(لیکن دنیا میں) ان کو ملتا رہے گا اُن کا حصہ' اس میں سے جو (ان کے لیے) لکھا گیا ہے۔''

دنیا میں رزق وغیرہ کا جو معاملہ ہے وہ ان کے کفر کی وجہ سے منقطع نہیں ہوگا' بلکہ دُنیوی زندگی میں وہ انہیں معمول کے مطابق ملتا رہے گا۔ یہ مضمون سورۂ بنی اسرائیل میں دوبارہ آئے گا۔

﴿حَتّٰٓى اِذَا جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ ۙ قَالُوْٓا اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ﴾ ''یہاں تک کہ جب ان کے پاس ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) آ جائیں گے ان (کی روحوں) کو قبض کرنے کے لیے تو وہ کہیں گے کہ کہاں ہیں وہ جن کو تم پکارا کرتے تھے اللہ کے سوا؟''

اب کہاں ہیں وہ تمہارے خود ساختہ معبود جن کے سامنے تم ماتھے رگڑتے تھے اور جن کے آگے گڑگڑاتے ہوئے دعائیں کیا کرتے تھے؟

﴿قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا وَشَهِدُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ﴿۳۷﴾﴾ ''وہ کہیں گے کہ وہ سب تو ہم سے گم ہو گئے' اور وہ خود اپنے خلاف یہ گواہی دیں گے کہ واقعتاً وہ کافر تھے۔''

**آیت ۳۸** ﴿قَالَ ادْخُلُوْا فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ فِي النَّارِ ۭ﴾

”کہا جائے گا اچھا شامل ہو جاؤ جنّوں اور انسانوں کی ان امتوں میں جو تم سے پہلے گزر چکی ہیں آگ میں (داخل ہونے کے لیے)۔“

یعنی ایک ایک قوم کا حساب ہوتا جائے گا اور مجرمین جہنم کے اندر جھونکے جاتے رہیں گے۔ پہلی نسل کے بعد دوسری نسل، پھر تیسری نسل وعلیٰ ہذا القیاس۔ اب وہاں ان میں مکالمہ ہوگا۔ بعد میں آنے والی ہر نسل کے مقابلے میں پہلی نسل کے لوگ بڑے مجرم ہوں گے، کیونکہ جو لوگ بدعات اور غلط عقائد کے موجد ہوتے ہیں اصل اور بڑے مجرم تو وہی ہوتے ہیں، ان ہی کی وجہ سے بعد میں آنے والی نسلیں بھی گمراہ ہوتی ہیں۔ لہٰذا قرآن مجید میں اہلِ جہنم کے جو مکالمات مذکور ہیں ان کے مطابق بعد میں آنے والے لوگ اپنے پہلے والوں پر لعنت کریں گے اور کہیں گے کہ تمہاری وجہ سے ہی ہم گمراہ ہوئے، لہٰذا تم لوگوں کو تو دوگنا عذاب ملنا چاہیے۔ اس طریقے سے وہ آپس میں ایک دوسرے پر لعن طعن کریں گے اور جھگڑیں گے۔

﴿كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا﴾ ”جب بھی کوئی امت (جہنم میں) داخل ہوگی تو وہ اپنے جیسی دوسری اُمت پر لعنت کرے گی۔“

﴿حَتّٰٓى اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا ۙ قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا﴾ ”یہاں تک کہ جب اس میں گر چکیں گے سب کے سب تو ان کے پچھلے کہیں گے اپنے اگلوں کے بارے میں کہ اے ہمارے ربّ! یہی لوگ ہیں جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا“

دنیا میں تو یہ لوگ اپنی نسلوں کے بارے میں کہتے تھے کہ وہ ہمارے آباء واَجداد تھے، ہمارے قابلِ احترام اسلاف تھے۔ یہ طور طریقے انہی کی ریتیں ہیں، انہی کی روایتیں ہیں اور ان کی ان روایتوں کو ہم کیسے چھوڑ سکتے ہیں؟ لیکن وہاں جہنم میں اپنے انہیں آباء واَجداد کے بارے میں وہ علی الاعلان کہہ دیں گے کہ اے اللہ! یہی ہیں وہ بدبخت جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا۔

﴿فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ؕ﴾ ”تو ان کو تو دوگنا عذاب دے آگ میں سے۔“

﴿قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۸﴾﴾ ”اللہ فرمائے گا (تم) سب کے لیے ہی دوگنا (عذاب) ہے، لیکن تمہیں اس کا شعور نہیں ہے۔“

جیسے یہ لوگ تمہیں گمراہ کر کے آئے تھے ویسے ہی تم بھی اپنے بعد والوں کو گمراہ کر کے



آئے ہو اور یہ سلسلہ دُنیا میں اسی طرح چلتا رہا۔ یہ تو ہر ایک کو اُس وقت چاہیے تھا کہ اپنی عقل سے کام لیتا۔ میں نے تم سب کو عقل دی تھی، دیکھنے اور سننے کی صلاحیتیں دی تھیں، نیکی اور بدی کا شعور دیا تھا۔ تمہیں چاہیے تھا کہ ان صلاحیتوں سے کام لے کر برے بھلے کا خود تجزیہ کرتے اور اپنے آباء واَجداد اور لیڈروں کی اندھی تقلید نہ کرتے۔ لہٰذا تم میں سے ہر شخص اپنی تباہی و بربادی کا خود ذمّہ دار ہے۔

**آیت ۳۹** ﴿وَقَالَتْ اُوْلٰىهُمْ لِاُخْرٰىهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ﴿۳۹﴾﴾ ”اور ان کے اگلے اپنے پچھلوں سے کہیں گے کہ تمہیں بھی تو ہم پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہو سکی، لہٰذا اب چکھو مزہ عذاب کا اپنے کرتوتوں کے بدلے میں۔“

## آیات ۴۰ تا ۴۳

اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۴۰﴾ لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَّمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۱﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَآ ۙ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۴۲﴾ وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ ۚ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۫ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ؕ وَنُوْدُوْٓا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾

**آیت ۴۰** ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ﴾ ”یقیناً جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور تکبّر کی بنا پر ان کو رد کیا، ان کے لیے آسمان کے دروازے کبھی نہیں کھولے جائیں گے“

اگرچہ یہ بات حتمیت سے نہیں کہی جا سکتی‘ تاہم قرآن مجید میں کچھ اس طرح کے اشارات ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ جہنم اِسی زمین پر برپا ہوگی اور ابتدائی نُزُل (مہمانی) والی جنت بھی یہیں پر بسائی جائے گی۔ ﴿وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ ۙ﴿۳﴾﴾ (الانشقاق) کی عملی کیفیت کو ذہن میں لانے سے یہ نقشہ تصور میں یوں آتا ہے کہ زمین کو جب کھینچا جائے گا تو یہ پچک جائے گی‘ جیسے ربڑ کی گیند کو کھینچا جائے تو وہ اندر کو پچک جاتی ہے۔ اس عمل میں زمین کے اندر کا سارا لاوا باہر نکل آئے گا جو جہنم کی شکل اختیار کر لے گا (واللہ اعلم)۔ احادیث میں مذکور ہے کہ روزِ محشر میدانِ عرفات کو کھول کر وسیع کر دیا جائے گا اور یہیں پر حشر ہوگا۔ قرآن حکیم میں ﴿وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ﴿۲۲﴾﴾ (الفجر) کے الفاظ بھی اس پر دلالت کرتے ہیں کہ پروردگارِ شانِ اجلال کے ساتھ نزول فرمائیں گے‘ فرشتے بھی فوج در فوج آئیں گے اور یہیں پر حساب کتاب ہوگا۔ گویا ’’قصۂ زمین برسرِ زمین‘‘ والا معاملہ ہوگا۔ اہل بہشت کی ابتدائی مہمان نوازی بھی یہیں ہوگی‘ لیکن پھر اہلِ جنت اپنے مراتب کے اعتبار سے درجہ بدرجہ اوپر کی جنتوں میں چڑھتے چلے جائیں گے‘ جبکہ اہلِ جہنم یہیں کہیں رہ جائیں گے‘ ان کے لیے آسمانوں کے دروازے کھولے ہی نہیں جائیں گے۔

﴿وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ ؕ﴾ ’’اور وہ جنت میں داخل نہیں ہوں گے یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکہ میں سے گزر جائے۔‘‘

اسے کہتے ہیں ’’تعلیق بالمحال‘‘۔ نہ یہ ممکن ہوگا کہ سوئی کے ناکہ میں سے اونٹ گزر جائے اور نہ ہی کفار کے لیے جنت میں داخل ہونے کی کوئی صورت پیدا ہوگی۔ بالکل یہی محاورہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی ایک جگہ استعمال کیا ہے۔ آپؑ کے پاس ایک دولت مند شخص آیا اور پوچھا کہ آپؑ کی تعلیمات کیا ہیں؟ جواب میں آپؑ نے نماز پڑھنے‘ روزہ رکھنے‘ غریبوں پر مال خرچ کرنے اور دوسرے نیک کاموں کے بارے میں بتایا۔ اس شخص نے کہا کہ نیکی کے یہ کام تو میں سب کرتا ہوں‘ آپ بتائیے اور میں کیا کروں؟ آپؑ نے فرمایا کہ ٹھیک ہے تم نے یہ ساری منزلیں طے کر لی ہیں تو اب آخری منزل یہ ہے کہ اپنی صلیب اٹھاؤ اور میرے ساتھ چلو! یعنی حق و باطل کی کشمکش میں جان و مال سے میرا ساتھ دو۔ یہ سن کر اس شخص کا چہرہ لٹک گیا اور وہ چلا گیا۔ اس پر آپؑ نے فرمایا کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے گزرنا ممکن ہے مگر کسی دولت مند شخص کا اللہ کی بادشاہت میں داخل ہونا ممکن نہیں ہے۔ یہاں یہ واقعہ قرآن میں مذکور محاورے



کے حوالے سے برسبیلِ تذکرہ آ گیا ہے‘ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس فرمان کو کسی معاملے میں بطورِ دلیل پیش کرنا مقصود نہیں۔

﴿وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۴۰﴾﴾ ’’اور اسی طرح ہم بدلہ دیتے ہیں مجرموں کو۔‘‘

**آیت ۴۱** ﴿لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَّمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۱﴾﴾ ’’ان کے لیے جہنم ہی کا بچھونا ہوگا اور اوپر سے اسی کا اوڑھنا ہوگا۔ اور اسی طرح ہم ظالموں کو بدلہ دیں گے۔‘‘

آگ کے گدے ہوں گے بچھانے کے لیے اور اسی کے لحاف ہوں گے اوڑھنے کے لیے۔ اور اسی آگ کے اندر ان کا گزر بسر ہوگا۔

**آیت ۴۲** ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَآ ۡ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۴۲﴾﴾ ’’اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے —— ہم کسی جان کو ذمہ دار نہیں ٹھہرائیں گے مگر اس کی وسعت کے مطابق —— وہی ہوں گے جنت والے‘ اس میں رہیں گے ہمیشہ ہمیش۔‘‘

یہ مضمون سورۃ البقرۃ کی آخری آیت میں بھی آ چکا ہے۔ اب یہاں پھر دہرایا گیا ہے کہ آخرت کا محاسبہ انفرادی طور پر ہوگا اور ہر فرد کی صلاحیتوں اور اُس کو ودیعت کی گئی نعمتوں کے عین مطابق ہوگا۔ کسی کی استطاعت سے زیادہ کی ذمہ داری اس پر نہیں ڈالی جائے گی۔

**آیت ۴۳** ﴿وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ﴾ ’’اور ہم نکال دیں گے جو کچھ ان کے سینوں میں ہوگا (ایک دوسرے کی طرف سے) کوئی میل‘‘

اہلِ ایمان بھی آخر انسان ہیں۔ باہمی معاملات میں ان کو بھی ایک دوسرے سے گلے اور شکوے ہو سکتے ہیں اور دلوں میں شکوک و شبہات جنم لے سکتے ہیں۔ دینی جماعتوں کے اندر بھی کسی مامور کو امیر سے‘ امیر کو مامور سے یا ایک رفیق کو دوسرے رفیق سے شکایت ہو سکتی ہے۔ کچھ ایسے گلے شکوے بھی ہو سکتے ہیں جو دنیا کی زندگی میں ختم نہ ہو سکے ہوں گے۔ ایسے گلے شکووں کے ضمن میں قرآن حکیم میں کئی مرتبہ فرمایا گیا کہ اہلِ جنت کو جنت میں داخل کرنے سے پہلے ان کے دلوں کو ایسی تمام آلائشوں سے پاک کر دیا جائے گا اور وہ لوگ باہم بھائی بھائی بن کر ایک دوسرے کے روبرو بیٹھیں گے: ﴿وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا

عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ﴿۴۷﴾ (الحجر) اسی لیے اہل ایمان کو سورۃ الحشر میں یہ دعا بھی تلقین کی گئی ہے: ﴿رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ﴿۱۰﴾﴾ ''اے ہمارے پروردگار! تو ہمارے اور ہمارے اُن بھائیوں کے گناہ معاف فرما دے جو ہم سے پہلے ایمان لائے اور اہلِ ایمان میں سے کسی کے لیے بھی ہمارے دل میں کوئی کدورت باقی نہ رہنے دے' بے شک تو رؤف اور رحیم ہے''۔ ان مضامین کی آیات کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول بھی (خاص طور پر سورۃ الحجر' آیت ۴۷ کے شانِ نزول میں) منقول ہے کہ یہ میرا اور معاویہؓ کا ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں جنت میں داخل کرے گا تو دلوں سے تمام کدورتیں صاف کر دے گا۔ ظاہر بات ہے کہ حضرت علی اور حضرت امیر معاویہ (رضی اللہ عنہما) کے درمیان جنگیں ہوئی ہیں تو کتنی کچھ شکایتیں باہمی طور پر پیدا ہوئی ہوں گی۔ ایسی تمام شکایتیں اور کدورتیں وہاں دور کر دی جائیں گی۔

﴿تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ﴾ ''اور اُن (کے بالاخانوں) کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔''

﴿وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۫ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ؕ﴾ ''اور وہ کہیں گے کُل شکر اور کُل تعریف اُس اللہ کے لیے ہے جس نے ہمیں یہاں تک پہنچا دیا' اور ہم یہاں تک نہیں پہنچ سکتے تھے اگر اللہ ہی نے ہمیں نہ پہنچا دیا ہوتا۔ یقیناً ہمارے رب کے رسول حق کے ساتھ آئے تھے۔''

﴿وَنُوْدُوْٓا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴿۴۳﴾﴾ ''اور (تب) انہیں پکارا جائے گا کہ یہ ہے وہ جنت جس کے تم وارث بنا دیے گئے ہو اپنے اعمال کی وجہ سے۔''

بندے کا مقامِ عبدیت اسی بات کا تقاضا کرتا ہے کہ وہ اللہ کے انعام و اکرام پر سراپا شکر بن کر پکار اٹھے کہ اے اللہ میں اس لائق نہیں تھا' میرے اعمال ایسے نہیں تھے' میں اپنی کوشش کی بنیاد پر کبھی بھی اس کا مستحق نہیں ہو سکتا تھا' یہ سارا تیرا فضل و کرم' تیری عطا اور تیری دین ہے' جبکہ اللہ تعالیٰ بندے کے حسنِ نیت اور اعمالِ صالحہ کی قدر افزائی کرتے ہوئے ارشاد فرمائے گا کہ میرے بندے' تو نے دنیا میں جو محنت کی تھی' یہ مقام تیری محنت کا انعام ہے' تیری کوشش کا ثمر ہے'



تیرے ایثار کا صلہ ہے۔ تو نے خلوصِ نیت سے حق کا راستہ چُنا تھا' اس میں تو نے نقصان بھی برداشت کیا' باطل کا مقابلہ کرنے میں تکالیف بھی اٹھائیں۔ چنانچہ بندے کی کوشش و محنت اور اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم دونوں چیزیں مل کر ہی بندے کی دائمی فلاح کو ممکن بناتی ہیں۔ ہم ایک نیک کام کا ارادہ کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نیت کے خلوص کو دیکھتے ہوئے اس کام کی توفیق دے دیتا ہے اور اسے ہمارے لیے آسان کر دیتا ہے۔ اگر ہم ارادہ ہی نہیں کریں گے تو اللہ کی طرف سے توفیق بھی نہیں ملے گی۔ اسی طرح اللہ کی توفیق و تیسیر کے بغیر محض ارادے سے بھی ہم کچھ نہیں کر سکتے۔

## آیات ۴۴ تا ۵۳

وَنَادٰٓی اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبَ النَّارِ اَنْ قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلْ وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا ؕ قَالُوْا نَعَمْ ۚ فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَیْنَهُمْ اَنْ لَّعْنَةُ اللّٰهِ عَلَی الظّٰلِمِیْنَ ۙ﴿۴۴﴾ الَّذِیْنَ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَیَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ كٰفِرُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَبَیْنَهُمَا حِجَابٌ ۚ وَعَلَی الْاَعْرَافِ رِجَالٌ یَّعْرِفُوْنَ كُلًّۢا بِسِیْمٰهُمْ ۚ وَنَادَوْٓا اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ ۫ لَمْ یَدْخُلُوْهَا وَهُمْ یَطْمَعُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَاِذَا صُرِفَتْ اَبْصَارُهُمْ تِلْقَآءَ اَصْحٰبِ النَّارِ ۙ قَالُوْا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۴۷﴾ وَنَادٰٓی اَصْحٰبُ الْاَعْرَافِ رِجَالًا یَّعْرِفُوْنَهُمْ بِسِیْمٰهُمْ قَالُوْا مَآ اَغْنٰی عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۴۸﴾ اَهٰٓؤُلَآءِ الَّذِیْنَ اَقْسَمْتُمْ لَا یَنَالُهُمُ اللّٰهُ بِرَحْمَةٍ ؕ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَیْكُمْ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ﴿۴۹﴾ وَنَادٰٓی اَصْحٰبُ النَّارِ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ اَفِیْضُوْا عَلَیْنَا مِنَ الْمَآءِ اَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ؕ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَی الْكٰفِرِیْنَ ۙ﴿۵۰﴾ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا دِیْنَهُمْ لَهْوًا وَّلَعِبًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا ۚ فَالْیَوْمَ نَنْسٰىهُمْ كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ یَوْمِهِمْ هٰذَا ۙ وَمَا كَانُوْا بِاٰیٰتِنَا یَجْحَدُوْنَ ﴿۵۱﴾ وَلَقَدْ

جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ ؕ يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۚ فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَآءَ فَيَشْفَعُوْا لَنَآ اَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ؕ قَدْ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝

**آیت ۴۴** ﴿وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبَ النَّارِ اَنْ قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا﴾ ''اور جنتی لوگ پکار کر کہیں گے جہنمیوں سے کہ ہم نے تو وہ وعدہ بالکل سچّا پایا ہے جو ہمارے ربّ نے ہم سے کیا تھا''

جن نعمتوں کا اللہ نے ہم سے وعدہ کیا تھا وہ ہمیں مل گئیں۔ اللہ کا وعدہ ہمارے حق میں سچ ثابت ہوا۔

﴿فَهَلْ وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا ؕ قَالُوْا نَعَمْ ۚ﴾ ''تو کیا تم نے بھی سچا پایا ہے وہ وعدہ جو تمہارے رب نے تم سے کیا تھا؟ وہ کہیں گے کہ ہاں!''

اہلِ جہنم جواب دیں گے کہ ہاں! ہمارے ساتھ بھی جو وعدے کیے گئے تھے وہ بھی سب پورے ہو گئے۔ جو وعیدیں ہمیں دنیا میں سنائی جاتی تھیں' عذاب کی جو مختلف شکلیں بتائی جاتی تھیں' وہ سب کی سب حقیقت کا روپ دھار کر ہمارے سامنے موجود ہیں اور اس وقت ہم ان میں گھرے ہوئے ہیں۔

﴿فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَيْنَهُمْ اَنْ لَّعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ۝﴾ ''تو (اُس وقت) پکارے گا ایک پکارنے والا ان کے مابین کہ اللہ کی لعنت ہے ظالموں پر۔''

**آیت ۴۵** ﴿الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ﴾ ''وہ لوگ جو روکتے تھے (اور خود بھی رُکتے تھے) اللہ کے راستے سے اور اس (راستے) میں کجی نکالتے تھے''

نہ صرف یہ کہ وہ خود ایمان نہیں لائے تھے' بلکہ دوسرے لوگوں کو بھی اس راستے سے روکنے کی حتی الوسع کوشش کرتے تھے۔ اگر کسی شخص کو محمد رسول اللہ ﷺ کی محفل کی طرف جاتے دیکھتے تو اسے ورغلانے اور بہکانے کے درپے ہو جاتے تھے کہ کہیں آپ ﷺ کی باتوں سے متاثر ہو کر ایمان نہ لے آئے۔



﴿وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ كٰفِرُوْنَ ۝﴾ ''اور یہ لوگ آخرت کے منکر تھے۔''

**آیت ۴۶** ﴿وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ ۚ﴾ ''اور ان (جنتیوں اور جہنمیوں) کے مابین ایک پردے کی دیوار ہوگی۔''

اہلِ جنت اور اہلِ جہنم کے درمیان ہونے والی اس نوعیت کی گفتگو کا نقشہ زیادہ واضح طور پر سورۃ الحدید میں کھینچا گیا ہے۔ وہاں (آیت نمبر ۱۳ میں) فرمایا گیا ہے: ﴿فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ؕ﴾ یعنی ایک طرف جنت اور دوسری طرف دوزخ ہوگی اور درمیان میں فصیل ہوگی جس میں ایک دروازہ بھی ہوگا۔

﴿وَعَلَى الْاَعْرَافِ رِجَالٌ يَّعْرِفُوْنَ كُلًّۢا بِسِيْمٰهُمْ ۚ﴾ ''اور دیوار کی برجیوں پر کچھ لوگ ہوں گے جو ہر ایک کو ان کی نشانی سے پہچانتے ہوں گے۔''

یہ اصحابِ اعراف اہلِ جنت کو بھی پہچانتے ہوں گے اور اہلِ جہنم کو بھی۔ قلعوں کی فصیلوں کے اوپر جو برجیاں اور جھروکے بنے ہوتے ہیں جہاں سے تمام اطراف و جوانب کا مشاہدہ ہو سکے' انہیں ''عرف'' (جمع اَعراف) کہا جاتا ہے۔ دوزخ اور جنت کی درمیانی فصیل پر بھی کچھ بُرجیاں اور جھروکے ہوں گے جہاں سے جنت و دوزخ کے مناظر کا مشاہدہ ہو سکے گا۔ ان پر وہ لوگ ہوں گے جو دنیا میں بین بین کے لوگ تھے' یعنی کسی طرف بھی یکسو ہو کر نہیں رہے تھے۔ ان کے اعمال ناموں میں نیکیاں اور بداعمالیاں برابر ہو جائیں گی' جس کی وجہ سے ابھی انہیں جنت میں بھیجنے یا جہنم میں جھونکنے کا فیصلہ نہیں ہوا ہوگا اور انہیں اعراف پر ہی روکا گیا ہوگا۔

﴿وَنَادَوْا اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ۫ لَمْ يَدْخُلُوْهَا وَهُمْ يَطْمَعُوْنَ ۝﴾ ''اور وہ (اصحابِ اعراف) جنت والوں کو پکار کر کہیں گے کہ آپ پر سلامتی ہو! وہ اس (جنت میں) ابھی داخل نہیں ہوئے ہوں گے' مگر انہیں اس کی بہت خواہش ہوگی۔''

وہ اہلِ جنت کو دیکھ کر انہیں بطور مبارک باد سلام کہیں گے اور ان کی اپنی شدید خواہش اور آرزو ہوگی کہ اللہ تعالیٰ انہیں بھی جلد از جلد جنت میں داخل کر دے' جو آخر کار پوری کر دی جائے گی۔

**آیت ۴۷** ﴿وَاِذَا صُرِفَتْ اَبْصَارُهُمْ تِلْقَآءَ اَصْحٰبِ النَّارِ ۙ قَالُوْا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝﴾ ''اور جب ان کی نگاہیں پھیری جائیں گی اہلِ جہنم کی طرف تو (اُس

وقت) وہ کہیں گے اے ہمارے پروردگار! ہمیں ان ظالموں کے ساتھ شامل نہ کر دیجیو۔''

جنت کے نظارے کے بعد ان کو جہنم کا منظر بھی دکھایا جائے گا' کہ اب ذرا جہنمیوں کی کیفیت کا بھی مشاہدہ کرلو۔ یہ لوگ ابھی تک ''بین الخوف والرجاء'' کی کیفیت میں ہوں گے۔ انہیں جنت میں داخلے کی امید بھی ہوگی اور جہنم میں جھونکے جانے کا خوف بھی۔ اس لیے جب وہ اہلِ جنت کی طرف دیکھیں گے تو انہیں سلام کریں گے اور ساتھ ہی ان کے دلوں میں اُمنگیں اور تمنائیں جاگ جائیں گی کہ اللہ ہمیں بھی ان کے ساتھ شامل کر دے۔ لیکن دوسری طرف جب اہلِ جہنم پر نظر پڑے گی تو فریاد کریں گے کہ پروردگار! ہم پر رحم فرمائیو اور ہمیں ان ظالم لوگوں کا ساتھی نہ بنائیو!

**آیت ۴۸** ﴿وَنَادٰٓی اَصْحٰبُ الْاَعْرَافِ رِجَالًا یَّعْرِفُوْنَهُمْ بِسِیْمٰهُمْ قَالُوْا مَآ اَغْنٰی عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ﴾ ''اور پکاریں گے اہلِ اعراف (اہلِ جہنم میں سے) ان لوگوں کو جنہیں وہ پہچانتے ہوں گے ان کی نشانی سے' کہیں گے کہ تمہارے کچھ کام نہ آئی تمہاری جمعیت اور (نہ وہ) جو کچھ تم تکبر کیا کرتے تھے۔''

وہ انہیں یاد دلائیں گے کہ وہ تمہارے حاشیہ نشین' تمہارے وہ لاؤ لشکر' تمہارا وہ غرور و تکبر' وہ جاہ و حشم سب کہاں گئے؟ اے ابوجہل! یہ تیرے ساتھ کیا ہوا؟ اور اے ولید بن مغیرہ! یہ تیرا کیا انجام ہوا؟

**آیت ۴۹** ﴿اَهٰٓؤُلَآءِ الَّذِیْنَ اَقْسَمْتُمْ لَا یَنَالُهُمُ اللّٰهُ بِرَحْمَةٍ﴾ ''کیا یہی وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں تم قسمیں کھایا کرتے تھے کہ نہیں نوازے گا انہیں اللہ اپنی کسی رحمت سے!''

اصحابِ اعراف کو جنت والوں میں فقراءِ صحابہؓ بھی نظر آئیں گے' وہاں وہ حضرت بلال ؓ کو بھی دیکھیں گے' وہاں ان کی نظر حضرت صہیب رومی ؓ اور حضرت یاسر ؓ پر بھی پڑے گی۔ چنانچہ وہ ان اصحابِ جنت کی طرف اشارہ کر کے جہنمیوں سے پوچھیں گے کہ کیا یہی وہ لوگ تھے جن کے بارے میں تم قسمیں کھا کھا کر کہا کرتے تھے کہ ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کسی طرح بھی ہم پر فضیلت نہیں دے سکتا' ان تک اللہ کی کوئی رحمت پہنچ ہی نہیں سکتی' کیونکہ تمہارے زعم میں تو وہ مفلس اور نادار تھے' گھٹیا طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور گرے پڑے لوگ تھے! اور تم



تھے کہ اُس وقت ان کے مقابلے میں اپنی دولت' حیثیت' وجاہت اور طاقت کے بَل پر اکڑا کرتے تھے۔

﴿اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَیْكُمْ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ﴾ ''(ان سے تو کہہ دیا گیا ہے کہ) داخل ہو جاؤ جنت میں' نہ تم پر کوئی خوف ہے اور نہ تم کسی غم سے دو چار ہو گے۔''

**آیت ۵۰** ﴿وَنَادٰٓی اَصْحٰبُ النَّارِ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ اَفِیْضُوْا عَلَیْنَا مِنَ الْمَآءِ اَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ﴾ ''اور جہنم والے آواز دیں گے جنت والوں کو کہ کچھ تو بہا دو ہماری طرف پانی میں سے یا اس رزق میں سے (کچھ دے دو) جو اللہ نے تمہیں دے رکھا ہے۔''

﴿قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَی الْكٰفِرِیْنَ﴾ ''وہ کہیں گے کہ اللہ نے حرام کر دی ہیں یہ دونوں چیزیں (جنت کا پانی اور رزق) کافروں پر۔''

اہلِ جنت جواب دیں گے کہ ہم تو شاید یہ چیزیں تم لوگوں کو دینا بھی چاہتے' کیونکہ ہماری شرافت سے تو یہ بعید تھا کہ تمہیں کورا جواب دیتے' لیکن کیا کریں' اللہ نے کافروں کے لیے جنت کی یہ سب چیزیں حرام کر دی ہیں' لہٰذا ہم یہ نعمتیں تمہاری طرف نہیں بھیج سکتے۔

**آیت ۵۱** ﴿الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا دِیْنَهُمْ لَهْوًا وَّلَعِبًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا﴾ ''(ان کے لیے) جنہوں نے اپنے دین کو تماشا اور کھیل بنا لیا تھا اور انہیں دنیا کی زندگی نے دھوکے میں مبتلا کر دیا تھا۔''

﴿فَالْیَوْمَ نَنْسٰىهُمْ كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ یَوْمِهِمْ هٰذَا﴾ ''لہٰذا آج کے دن ہم بھی انہیں نظر انداز کر دیں گے' جیسا کہ انہوں نے اس دن کی ملاقات کو بھلائے رکھا تھا''

''نسیان'' کے ایک معنی تو ہیں بھول جانا' جبکہ اس کے دوسرے معنی ہیں جان بوجھ کر نظر انداز کرنا۔

﴿وَمَا كَانُوْا بِاٰیٰتِنَا یَجْحَدُوْنَ﴾ ''اور جیسا کہ وہ ہماری آیات کا انکار کرتے رہے تھے۔''

**آیت ۵۲** ﴿وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰی عِلْمٍ هُدًی وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ

يُّؤْمِنُوْنَ﴿۵۲﴾﴾ ''اور ہم لے آئے ہیں ان کے پاس ایک کتاب‘ جس کی ہم نے پوری تفصیل بیان کر دی ہے علمِ قطعی کی بنیاد پر‘ ہدایت بھی ہے اور رحمت بھی ان لوگوں کے لیے جو ایمان لے آئیں۔''

آیت ۵۳ ﴿هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ ؕ﴾ ''یہ کس چیز کا انتظار کر رہے ہیں سوائے اس کی حقیقت کے مشاہدے کے!''

یعنی کیا یہ لوگ آیاتِ عذاب کے عملی ظہور کا انتظار کر رہے ہیں؟ کیا یہ انتظار کر رہے ہیں کہ وقفۂ مہلت کا یہ بند ٹوٹ جائے اور واقعتاً ان کے اوپر عذاب کا دھارا چھوٹ پڑے۔ کیا یہ لوگ اس انجام کا انتظار کر رہے ہیں؟

﴿يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۚ﴾ ''جس دن اس کا مصداق ظاہر ہو جائے گا تو کہیں گے وہ لوگ جنہوں نے پہلے اسے نظر انداز کیے رکھا تھا کہ یقیناً ہمارے پروردگار کے رسول حق کے ساتھ آئے تھے۔''

﴿فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَآءَ فَيَشْفَعُوْا لَنَآ اَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ؕ﴾ تو کیا (اب) ہیں ہمارے لیے کوئی شفاعت کرنے والے کہ ہماری شفاعت کریں یا کوئی صورت کہ ہمیں (دنیا میں) لوٹا دیا جائے تاکہ ہم عمل کریں اس کے برعکس جو کچھ (پہلے) ہم کرتے رہے تھے!''

﴿قَدْ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ﴿۵۳﴾﴾ ''وہ تو اپنے آپ کو برباد کر چکے‘ اور جو افترا وہ کرتے رہے تھے وہ ان سے گم ہو گیا۔''

اس دن وہ لوگ دوبارہ دنیا میں جانے کی خواہش کریں گے‘ لیکن تب انہیں اس طرح کا کوئی موقع فراہم کیے جانے کا کوئی امکان نہیں ہو گا۔

## آیات ۵۴ تا ۵۸

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۣ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا ۙ وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۢ بِاَمْرِهٖ ۭ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ۭ تَبٰرَكَ اللّٰهُ



رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ﴿۵۴﴾ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ﴿۵۵﴾ وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ۭ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ﴿۵۶﴾ وَهُوَ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًۢا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ۭ حَتّٰٓي اِذَآ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَاۗءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۭ كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ﴿۵۷﴾ وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۚ وَالَّذِيْ خَبُثَ لَا يَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا ۭ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّشْكُرُوْنَ﴿۵۸﴾

آیت ۵۴ ﴿اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۣ﴾ ''بیشک تمہارا پروردگار وہی اللہ ہے جس نے پیدا کیے آسمان اور زمین چھ دنوں میں‘ پھر متمکن ہوا عرش پر۔''

عرش کی حقیقت اور اللہ تعالیٰ کے عرش پر متمکن ہونے کی کیفیت ہمارے تصور سے بالاتر ہے۔ اس لحاظ سے یہ آیت متشابہات میں سے ہے۔ اس کی اصل حقیقت کو اللہ ہی جانتا ہے۔ ممکن ہے واقعتاً یہ کوئی مجسم شے ہو اور کسی خاص جگہ پر موجود ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ محض استعارہ ہو۔ عالمِ غیب کی خبریں دینے والی اس طرح کی قرآنی آیات مستقل طور پر آیاتِ متشابہات کے زمرے میں آتی ہیں۔ البتہ جن آیات میں بعض سائنسی حقائق بیان ہوئے ہیں‘ ان میں سے اکثر کی صداقت سائنسی ترقی کے باعث منکشف ہو چکی ہے‘ اور وہ ''محکمات'' کے درجے میں آ چکی ہیں۔ اس سلسلے میں آئندہ تدریجاً مزید پیش رفت کی توقع بھی ہے۔ (واللہ اعلم!)

﴿يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا ۙ﴾ ''وہ ڈھانپ دیتا ہے رات کو دن پر (یا رات کو ڈھانپ دیتا ہے دن سے) جو اُس کے پیچھے لگا آتا ہے دوڑتا ہوا''

دن رات کے پیچھے آتا ہے اور رات دن کے پیچھے آتی ہے۔

﴿وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۢ بِاَمْرِهٖ ۭ﴾ ''اور اُس نے سورج‘ چاند اور ستارے پیدا کیے جو اس کے حکم سے اپنے اپنے کاموں میں لگے ہوئے ہیں۔''

سورج‘ چاند اور ستاروں کے مسخّر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جو بھی قاعدہ یا قانون ان کے لیے مقرر کر دیا گیا ہے‘ وہ اس کی اطاعت کر رہے ہیں۔

﴿اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ؕ﴾ ’’آگاہ ہو جاؤ اُسی کے لیے ہے خلق اور (اُسی کے لیے ہے) امر۔‘‘

ان الفاظ کے دو مفہوم ذہن میں رکھئے۔ ایک تو بہت سادہ اور سطحی مفہوم ہے کہ یہ کائنات اللہ نے تخلیق کی ہے اور اب اس میں اسی کا حکم کارفرما ہے۔ یعنی احکامِ طبیعیہ بھی اُسی کے بنائے ہوئے ہیں جن کے مطابق کائنات کا نظام چل رہا ہے‘ اور احکامِ تشریعیہ بھی اُسی نے اتارے ہیں کہ یہ اوامر اور یہ نواہی ہیں‘ انسان ان کے مطابق اپنی زندگی گزارے۔ مگر اس کا دوسرا اور گہرا مفہوم یہ ہے کہ کائنات میں تخلیق دو سطح پر ہوئی ہے۔ اس لحاظ سے یہ دو الگ الگ عالم ہیں‘ ایک عالمِ خلق ہے اور دوسرا عالمِ امر۔ عالمِ امر میں عدمِ محض سے تخلیق (creation ex nihilio) ہوتی ہے اور اس میں تخلیق کے لیے بس ’’کُن‘‘ کہا جاتا ہے تو چیز وجود میں آ جاتی ہے (فَیَکُون)۔ اس کے لیے نہ وقت درکار ہے اور نہ کسی مادے کی ضرورت ہوتی ہے۔ فرشتوں‘ انسانی ارواح اور وحی کا تعلق عالمِ امر سے ہے۔ اسی لیے ان کے سفر کرنے کے لیے بھی کوئی وقت درکار نہیں ہوتا۔ فرشتہ آنکھ جھپکنے میں زمین سے ساتویں آسمان پر پہنچ جاتا ہے۔

دوسری طرف عالمِ خلق میں ایک شے سے کوئی دوسری شے طبعی قوانین اور ضوابط کے مطابق بنتی ہے۔ اس میں مادہ بھی درکار ہوتا ہے اور وقت بھی لگتا ہے۔ جیسے رحمِ مادر میں بچے کی تخلیق میں کئی ماہ لگتے ہیں۔ آم کی گٹھلی سے پودا اُگنے اور بڑھ کر درخت بننے کے لیے کئی سال کا وقت درکار ہوتا ہے۔ عالمِ خلق میں جب زمین اور آسمانوں کی تخلیق ہوئی تو قرآن کے مطابق یہ چھ دنوں میں مکمل ہوئی۔ (یہ آیت بھی ابھی تک متشابہات میں سے ہے‘ اگرچہ اس کے بارے میں اب جلد حقیقت منکشف ہونے کے امکانات ہیں۔) اس کی حقیقت کے بارے میں اللہ ہی جانتا ہے کہ ان چھ دنوں سے کتنا زمانہ مراد ہے۔ اس کا دورانیہ کئی لاکھ سال پر بھی محیط ہو سکتا ہے۔ خود قرآن کے مطابق ہمارا ایک دن اللہ کے نزدیک ایک ہزار سال کا بھی ہو سکتا ہے (سورۃ السجدۃ‘ آیت ۵) اور پچاس ہزار سال کا بھی (سورۃ المعارج‘ آیت ۴)۔

یہ قرآن مجید کا اعجاز ہے کہ انتہائی پیچیدہ علمی نکتے کو بھی ایسے الفاظ اور ایسے پیرائے میں بیان کر دیتا ہے کہ ایک عمومی ذہنی سطح کا آدمی بھی اسے پڑھ کر مطمئن ہو جاتا ہے‘ جبکہ ایک فلسفی و



حکیم انسان کو اسی نکتے کے اندر علم و معرفت کا بحرِ بے کراں موجزن نظر آتا ہے۔ چنانچہ پندرہ سو سال پہلے صحرائے عرب کے ایک بدو کو اس آیت کا یہ مفہوم سمجھنے میں کوئی الجھن محسوس نہیں ہوئی ہو گی کہ یہ کائنات اللہ کی تخلیق ہے اور اسی کو حق ہے کہ اس پر اپنا حکم چلائے۔ مگر جب ایک صاحبِ علم محقق اس لفظ ’’امر‘‘ پر غور کرتا ہے اور پھر قرآن مجید میں غوطہ زنی کرتا ہے کہ یہ لفظ ’’امر‘‘ قرآن مجید میں کہاں کہاں‘ کن کن معانی میں استعمال ہوا ہے‘ اور پھر ان تمام مطالب و مفاہیم کو آپس میں مربوط کر کے دیکھتا ہے تو اس پر بہت سے علمی حقائق منکشف ہوتے ہیں۔ بہرحال عالمِ خلق ایک الگ عالم ہے اور عالمِ اَمر الگ‘ اور اِن دونوں کے قوانین و ضوابط بھی الگ الگ ہیں۔

﴿تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۵۴﴾﴾ ’’بہت بابرکت ہے اللہ جو تمام جہانوں کا رب ہے۔‘‘

**آیت ۵۵** ﴿اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۵۵﴾﴾ ’’پکارتے رہا کرو اپنے رب کو عاجزی کے ساتھ اور چپکے چپکے‘ یقیناً وہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔‘‘

گویا زیادہ بلند آواز سے دعا مانگنا اللہ کے ہاں پسندیدہ نہیں ہے۔

**آیت ۵۶** ﴿وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ؕ﴾ ’’اور زمین میں اس کی اصلاح کے بعد فساد مت مچاؤ اور اللہ کو پکارا کرو خوف اور امید کے ساتھ۔‘‘

اللہ کو پکارنے‘ اس سے دعا کرنے کے دو پہلو (dimensions) پہلے بتائے گئے کہ اللہ کو جب پکارو تو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے دل میں پکارو۔ اب اس ضمن میں مزید فرمایا گیا کہ اللہ کے ساتھ تمہارا معاملہ ہمیشہ ’’بین الخوف والرجاء‘‘ رہنا چاہیے۔ ایک طرف خوف کا احساس بھی ہو کہ اللہ پکڑ نہ لے‘ کہیں سزا نہ دے دے‘ اور دوسری طرف اس کی مغفرت اور رحمت کی قوی امید بھی دل میں ہو۔ لہٰذا فرمایا کہ اللہ سے دعا کرتے ہوئے تمہاری دلی اور روحانی کیفیت ان دونوں کے بین بین ہونی چاہیے۔

﴿اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۶﴾﴾ ’’یقیناً اللہ کی رحمت اہلِ احسان

بندوں کے بہت ہی قریب ہے۔''

**آیت ۵۷** ﴿وَهُوَ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ بُشْرًۢا بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ﴾ ''اور وہی ہے جو بھیجتا ہے ہوائیں بشارت دیتی ہوئی' اس کی رحمت کے آگے آگے۔''

یعنی ابرِ رحمت سے پہلے ہواؤں کے ٹھنڈے جھونکے گویا بشارت دے رہے ہوتے ہیں کہ بارش آنے والی ہے۔ اس کیفیت کا صحیح ادراک کرنے کے لیے کسی ایسے خطے کا تصور کیجیے جہاں زمین مُردہ اور بے آب و گیاہ پڑی ہے' لوگ آسمان کی طرف نظریں لگائے بارش کے منتظر ہیں۔ اگر وقت پر بارش نہ ہوئی تو بیج اور محنت دونوں ضائع ہو جائیں گے۔ ایسے میں ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے جب بارانِ رحمت کی نوید سناتے ہیں تو وہاں کے باسیوں کے لیے اس سے بڑی بشارت اور کیا ہوگی۔

﴿حَتّٰۤی اِذَاۤ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا﴾ ''یہاں تک کہ وہ ہوائیں اٹھا لاتی ہیں بڑے بڑے بھاری بادل''

یہ بادل کس قدر بھاری ہوتے ہوں گے' ان کا وزن انسانی حساب و شمار میں آنا ممکن نہیں۔ اللہ کی قدرت اور اس کی حکمت کے سبب لاکھوں ٹن پانی کو ہوائیں روئی کے گالوں کی طرح اڑائے پھرتی ہیں۔

﴿سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّیِّتٍ﴾ ''تو ہم ہانک دیتے ہیں اس (بادل) کو ایک مردہ زمین کی طرف''

ہوائیں ہمارے حکم سے اس بادل کو کسی بے آب و گیاہ وادی کی طرف لے جاتی ہیں اور بارانِ رحمت اس وادی میں ایک نئی زندگی کی نوید ثابت ہوتی ہے۔

﴿فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ﴾ ''پھر ہم اس سے پانی برساتے ہیں اور پھر اس سے ہر طرح کے میوے نکال لاتے ہیں۔''

بارش کے بعد وہ خشک اور مُردہ زمین گھاس' فصلوں اور پھلدار پودوں کی روئیدگی کی شکل میں اپنے خزانے اُگل دیتی ہے۔

﴿كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰی لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ﴾ ''اسی طرح ہم مُردوں کو نکال لائیں گے (زمین سے) تاکہ تم نصیحت اخذ کرو۔''



دراصل بادلوں اور ہواؤں کے مظاہر کی تفصیل بیان کر کے ایک عام ذہن کو تشبیہہ کے ذریعے سے بعث بعد الموت کی حقیقت کی طرف متوجہ کرنا مقصود ہے۔ یعنی مردہ زمین کو دیکھو! اس کے اندر زندگی کے کچھ بھی آثار باقی نہیں رہے تھے' حشرات الارض اور پرندے تک وہاں نظر نہیں آتے تھے' اس زمین کے باسی بھی مایوس ہو چکے تھے' لیکن اس مردہ زمین پر جب بارش ہوئی تو یکایک اس میں زندگی پھر سے عود کر آئی اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے ع ''مگر اب زندگی ہی زندگی ہے موجزن ساقی!'' کی مجسم تصویر بن گئی۔ بنجر زمین ہریالی کی سبز پوشاک پہن کر دلہن کی طرح سج گئی۔ حشرات الارض کا اژدہام! پرندوں کی زمزمہ پردازیاں! اس کے باسیوں کی رونقیں! گویا بارش کے طفیل زندگی پوری چہل پہل کے ساتھ وہاں جلوہ گر ہو گئی۔ اس آسان تشبیہہ سے ایک عام ذہنی استعداد رکھنے والے انسان کو حیات بعد الموت کی کیفیت آسانی سے سمجھ میں آ جانی چاہیے کہ زمین کے اندر پڑے ہوئے مردے بھی گویا بیجوں کی مانند ہیں۔ جب اللہ کا حکم آئے گا' یہ بھی نباتات کی مانند پھوٹ کر باہر نکل آئیں گے۔

**آیت ۵۸** ﴿وَالْبَلَدُ الطَّیِّبُ یَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۚ وَالَّذِیْ خَبُثَ لَا یَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا ؕ﴾ ''اور زرخیز زمین تو اپنے رب کے حکم سے اپنا سبزہ نکالتی ہے' اور جو (زمین) خراب ہے وہ کچھ نہیں نکالتی مگر کوئی ناقص سی چیز۔''

سرائیکی زبان میں ایک لفظ ''نکھد'' استعمال ہوتا ہے' یہ اس عربی لفظ ''نَکِد'' سے ملتا جلتا ہے۔ یعنی بالکل ردی اور گھٹیا چیز۔

﴿كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّشْكُرُوْنَ﴾ ''اسی طرح ہم اپنی آیات کو گردش میں لاتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو (ان کی) قدر کرنے والے ہوں۔''

اللہ تعالیٰ اس قرآن کے ذریعے سے اپنی نشانیاں گوناگوں پہلوؤں سے نمایاں کرتا ہے تاکہ لوگ ان کو سمجھیں' ان کو پہچانیں اور ان کی قدر کریں۔ یہ تصریفِ آیات اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے بشرطیکہ اس کی قدر کرنے والے لوگ ہوں۔ ❁❁

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت و تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

# روزہ

## آفاقیت' احکام' فضائل اور جدید فقہی مسائل

حافظ محمد زاہد☆

توحید ورسالت کی شہادت کے بعد نماز' روزہ' زکوٰۃ اور حج اسلام کے عناصرِ اربعہ ہیں۔ ایسی کئی احادیث ہیں جن میں رسول اللہ ﷺ نے ان پانچوں چیزوں کو اسلام کے ارکان اور ستون بتایا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

((بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ: شَهَادَةِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ' وَاِقَامِ الصَّلَاةِ' وَاِیْتَاءِ الزَّكَاةِ' وَحَجِّ الْبَیْتِ' وَصَوْمِ رَمَضَانَ)) (۱)

''اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے: گواہی دینا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں اور محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں' نماز قائم کرنا' زکوٰۃ ادا کرنا' بیت اللہ کا حج کرنا اور رمضان المبارک کے روزے رکھنا۔''

اسی طرح حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی حدیثِ جبرائیل میں اسلام کے متعلق سوال کے جواب میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((اَلْاِسْلَامُ اَنْ تَشْهَدَ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ' وَتُقِیْمَ الصَّلَاةَ' وَتُؤْتِیَ الزَّكَاةَ' وَتَصُوْمَ رَمَضَانَ' وَتَحُجَّ الْبَیْتَ اِنِ اسْتَطَعْتَ اِلَیْهِ سَبِیْلًا)) (۲)

''اسلام یہ ہے کہ تو گواہی دے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی سچا معبود نہیں اور یہ کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں' اور نماز قائم کرے' اور زکوٰۃ ادا کرے اور رمضان کے روزے رکھے اور استطاعت ہو تو بیت اللہ کا حج کرے۔''

اور پھر ان چار چیزوں میں سے بھی نماز اور روزہ کی زیادہ اہمیت ہے' اس لیے کہ یہ ہر مسلمان پر

☆ فاضل وفاق المدارس' ایم اے اسلامیات وادارتی معاون' قرآن اکیڈمی لاہور pmzahids@yahoo.com



فرض ہیں' جبکہ زکوٰۃ صاحبِ نصاب پر اور حج صاحبِ استطاعت پر فرض ہے۔

اس مضمون کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ حصہ اول روزہ کی آفاقیت سے متعلق ہے' حصہ دوم اسلام میں روزہ کا حکم اور اس کی فضیلت سے متعلق ہے' جبکہ حصہ سوم روزے کے جدید فقہی مسائل پر مشتمل ہے۔

## روزہ کی آفاقیت

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الصِّیَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴿۱۸۳﴾﴾ (البقرۃ)

''اے ایمان والو! تم پر روزہ رکھنا فرض کر دیا گیا ہے جیسے تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا تاکہ تم تقویٰ اختیار کرو۔''

﴿كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ فرما کر اللہ تعالیٰ نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کر دیا کہ تم پر روزوں کی یہ فرضیت کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ ہم نے تم سے پہلی امتوں پر بھی روزے اسی طرح فرض کیے تھے جیسے تم پر کیے جا رہے ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ روزے کی یہ عبادت آفاقی ہے جو دنیا کے تقریباً تمام مذاہب میں پائی جاتی ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کی تردید ممکن نہیں۔ روزہ کی اس آفاقی حیثیت کو مختلف انسائیکلوپیڈیاز نے بیان کیا ہے۔

Encyclopedia of Religion میں لفظ روزہ (Fasting) کے تحت مضمون نگار لکھتا ہے:

''روزہ یعنی غذا سے مکمل یا جزوی پرہیز ایک ایسا آفاقی عمل ہے جو مشرق ومغرب کی تقریباً سبھی تہذیبوں میں پایا جاتا ہے۔'' (۳)

Encyclopedia Britannica کا مضمون نگار لکھتا ہے:

''خاص مقاصد کے لیے یا اہم مقدس اوقات کے دوران یا ان سے قبل روزہ رکھنا دنیا کے بڑے بڑے مذاہب کا خاصہ ہے۔'' (۴)

Jewish Encyclopedia میں ''روزہ اور روزہ کے ایام'' کے تحت مضمون نگار نے اس حقیقت کو یوں واضح کیا ہے:

''روزے کی تعریف عموماً یہ کی جاتی ہے کہ مذہبی اور اخلاقی مقاصد کے حصول کی خاطر

خوش دلی سے جسم کو ایک مقررہ مدت کے لیے تمام قدرتی غذاؤں سے محروم رکھنا۔
روزے کے اس دستور کو دنیا کے تمام مذاہب میں بہت مقبولیت حاصل رہی ہے۔
اگرچہ یہ حقیقت بھی ہے کہ مختلف مذاہب اور قوموں میں اس کے محرکات اور اس کی
شکلیں مختلف رہی ہیں۔''(۵)

اب ہم بطور مثال چند غیر اسلامی مذاہب اور تہذیبوں کا ذکر کرتے ہیں جن میں کسی نہ کسی صورت میں روزہ کا تصور پایا جاتا ہے۔

## ہندومت میں روزہ کا تصور

اس تہذیب میں روزہ کے لیے ''برت'' کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے اور یہ برت مختلف مواقع پر رکھا جاتا ہے' مثلاً عورتیں دیویوں کو خوش کرنے کے لیے برت رکھتی ہیں' جوگی اپنے چلّہ کشی کے دوران اکل وشُرب سے پرہیز کرتے ہیں' جب چاند پورا ہوتا ہے تو اس دن بیویاں اپنے شوہروں کی لمبی عمر کے لیے برت رکھتی ہیں' گناہوں کے کفّارے اور بدشگونی سے بچنے کے لیے برت رکھا جاتا ہے۔ الغرض یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ہندومت درحقیقت روزوں' دعوتوں اور تہواروں کا مذہب ہے۔

اس مذہب کے ایک نمائندے ٹی ایم پی مہادیون (صدر شعبہ فلسفہ' مدراس یونیورسٹی) ہندو مذہب اور ہندو سماج میں روزہ کی حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ان تہواروں میں جن کو سالانہ منایا جاتا ہے بعض تہوار روزہ (برت) کے لیے مخصوص ہیں، جو تزکیۂ نفس کے لیے رکھا جاتا ہے۔ ہر ہندو فرقے نے دعا وعبادت کے لیے کچھ دن مقرر کر لیے ہیں جن میں اکثر افراد روزہ رکھتے ہیں۔ ان میں سب سے خاص ''ویکنٹا ایکادشی'' کا تہوار ہے' جو ''وشنو'' کی طرف منسوب ہے' لیکن اس میں صرف وشنو ہی کے ماننے والے نہیں بلکہ دوسرے بہت سے لوگ بھی روزہ رکھتے ہیں۔ اس تہوار میں وہ دن میں روزہ رکھتے ہیں اور رات کو پوجا کرتے ہیں۔''(۶)

## جین مت میں روزہ کا تصور

جین مت میں یہ عقیدہ پایا جاتا ہے کہ راہبانہ ریاضتیں انسان کے باطن کی اصلاح کرتی ہیں اور وہ ان ریاضتوں میں روزے کو بھی شامل کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ لڑکیاں اپنی شادی سے پہلے روزے رکھتی اور دعا کرتی ہیں کہ انہیں اچھا شوہر اور خوش گوار زندگی حاصل ہو۔ مولانا سید سلیمان ندوی ''سیرت النبی ﷺ'' میں جین دھرم کے ہاں روزوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:



''ہندوستان کے تمام مذاہب میں سے جینی دھرم میں روزہ کی سخت شرائط ہیں' چالیس چالیس دن تک کا ان کے یہاں ایک روزہ ہوتا ہے۔ گجرات ودکن میں ہر سال جینی کئی کئی ہفتہ کا روزہ رکھتے ہیں۔''(۷)

## پارسی مذہب میں روزہ کا تصور

قدیم پارسی مذہب میں کبھی کبھار روزہ رکھا جاتا ہے' لیکن عام طور پر روزہ رکھنا پسند نہیں کیا جاتا۔ اس مذہب کے پیروؤں کا خیال ہے کہ روح کی ترقی کے لیے جسم کو روزے کی مشقتوں میں ڈالنا درست نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہمارا روزہ یہ ہے کہ ہم اپنی زبان' آنکھوں' کانوں اور ہاتھوں سے کوئی گناہ نہ سرزد ہونے دیں۔ دوسرے مذاہب میں جو روزہ کھانا پینا چھوڑنے سے ہوتا ہے' ہمارے ہاں وہ روزہ گناہ نہ کرنے سے ہوتا ہے۔

مولانا سید سلیمان ندوی ''سیرت النبی ﷺ'' میں پارسیوں کے ہاں روزے کے بارے میں لکھتے ہیں:

''پارسی مذہب میں گو عام پیروؤں پر روزہ فرض نہیں' لیکن ان کی الہامی کتاب کی ایک آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ روزہ کا حکم ان کے ہاں موجود تھا۔ خصوصاً مذہبی پیشواؤں کے لیے تو پنج سالہ روزہ ضروری تھا۔''(۸)

پارسیوں کے بارے میں ان معلومات سے پتا چلتا ہے کہ وہ ابتدا میں روزے سے نہ صرف واقف تھے بلکہ اسے ایک مذہبی عمل کے طور پر اپنائے ہوئے تھے' لیکن بعد کے ادوار میں' غالباً جب دوسرے مذاہب کے حوالے سے سخت روزوں کا تصور سامنے آیا' تو اس کے خلاف ردّعمل پیدا ہوا اور ان کے ہاں روزے مفقود ہو گئے۔

## بدھ مت میں روزہ کا تصور

بدھ مت کے بھکشو (تارک الدنیا) بھی کچھ خاص دنوں میں روزے رکھتے اور اپنے گناہوں سے توبہ کرتے ہیں۔ چنانچہ بدھ مت میں جن دس چیزوں سے اجتناب کا حکم دیا گیا ہے ان میں سے ایک ممنوع اوقات میں کھانا ہے۔ ان کی تعلیم یہ ہے کہ بھکشوؤں کو ضرور کھانا چاہیے' لیکن دن میں صرف ایک دفعہ' اس کے بعد وہ دن بھر کچھ نہ کھائیں۔ اس کے علاوہ بدھا کے یومِ وفات سے متصل پہلے پانچ روزے رکھے جاتے ہیں۔ ان روزوں کے علاوہ ان کے ہاں بھی ہندومت کی طرح پورے چاند کے دنوں میں روزہ رکھنا لازم ہے' جبکہ تبت کے علاقے میں تو بدھا کے پیروؤں کے ہاں چار دن کا مسلسل روزہ رکھنے کی ایک تقریب منعقد کی جاتی ہے۔(۹)

## قدیم تہذیبوں میں روزہ کا تصور

اس عنوان کے تحت ہم چند قدیم تہذیبوں کا روزہ کے حوالے سے مطالعہ کرتے ہیں۔ قدیم ایرانی تہذیب میں اگرچہ روزہ عام نہیں تھا' لیکن کسی عزیز کی موت کے بعد تین راتوں تک روزہ رکھا جاتا تھا اور اس دوران تازہ گوشت پکایا اور کھایا نہیں جاتا تھا۔ قدیم جاپانی تہذیب میں جزوی روزہ کا تصور ملتا ہے' جبکہ جاپان کے قریبی ملک کوریا میں یہ رواج ہے کہ مرنے والے کے رشتہ دار ایک دن کا روزہ رکھتے ہیں' لیکن اس کے بیٹے اور پوتے تین دن کے روزے رکھتے ہیں۔ رومی اور یونانی تہذیب کے ماننے والوں کا یہ عقیدہ ہے کہ دیوی دیوتاؤں کی قُربت حاصل کرنے یا ان سے دانائی پانے کے لیے روزے کا عمل بہت معاون ثابت ہوتا ہے۔ قدیم مصری تہذیب میں گناہوں سے توبہ کرنے اور خدا کے عذاب سے بچنے کے لیے روزے رکھے جاتے ہیں اور بادشاہوں کے یوم وفات پر عوام روزے رکھتے ہیں۔

بابل اور نینوا کی تہذیب قدیم تہذیبوں میں سے تھی۔ ان کے ہاں بھی ہمیں روزے کا رواج ملتا ہے۔ یہ لوگ روزے کو خدا کے عذاب سے بچنے کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ یونس علیہ السلام نینوا میں آشوریوں کی طرف مبعوث ہوئے۔ ان لوگوں نے پہلے ان کی تکذیب کی' لیکن بعد میں عذابِ الٰہی کے آثار دیکھ کر ایمان لے آئے تو اس موقع پر انہوں نے جو توبہ کی تھی' تورات میں اسے ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

> ''نینوا کے باشندے خدا پر ایمان لائے اور روزے کا اعلان کر کے سب کے سب' کیا ادنیٰ کیا اعلیٰ ٹاٹ سے ملبس ہوئے' اور یہ بات شاہ نینوا کو بھی پہنچ گئی تو اس نے تخت سے اٹھ کر شاہی لباس اتار ڈالا' اور ٹاٹ اوڑھ کر راکھ پر بیٹھ گیا اور فرمان صادر کیا کہ بادشاہ اور ارکانِ دولت کے حکم سے نینوا میں یہ اعلان ہوا کہ کوئی انسان یا حیوان یا گائے بیل یا بھیڑ بکری نہ کچھ چکھے' نہ کھائے اور نہ پانی پیے۔ علاوہ اس کے انسان و حیوان ٹاٹ اوڑھیں اور خداوند کے حضور گریہ وزاری کریں اور ہر ایک اپنی بری روش اور اپنے ہاتھ کے ظلم سے توبہ کرے۔''(۱۰)

اس کے علاوہ بھی مختلف علاقائی مذاہب اور قدیم تہذیبوں میں روزہ کا تصور ملتا ہے۔ مثلاً چینی کلاسیکی مذہبی رسوم میں ایک رسم ''چائی'' کہلاتی ہے۔ اس رسم میں قربانی سے پہلے روزے رکھے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ چینیوں کے ہاں ماتمی روزوں کا تصور بھی ملتا ہے' یہ روزے مرنے والے آدمی کے رشتے دار رکھتے ہیں۔ چین میں کنفیوشزم کے پیروکار بھی ان دنوں



میں روزے رکھتے ہیں جن میں آباء و اَجداد کی ارواح کی عبادت کی جاتی ہے۔ الغرض ہم کہہ سکتے ہیں کہ دنیا میں موجود تقریباً تمام مذاہب اور تہذیبوں میں روزہ کا کسی حد تک تصور موجود ہے۔

## آسمانی مذاہب میں روزہ کا تصوّر

اب ہم آسمانی مذاہب یعنی یہودیت اور عیسائیت میں روزہ کے تصور کا مختصراً جائزہ لیں گے۔ یہود و نصاریٰ کی شریعت میں بھی روزہ ایک عام عبادت ہے۔ بائبل میں اُن کے روزوں کا ذکر جگہ جگہ ہوا ہے اور اِس کے لیے خاص اِس لفظ کے علاوہ بعض مقامات پر ''جان کو دکھ دینے'' اور ''نفس کشی کرنے'' کی تعبیرات بھی اختیار کی گئی ہیں۔

### یہودیت میں روزہ کا تصور

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جو نسل ان کے پوتے حضرت یعقوب علیہ السلام سے آگے چلی' وہ بنی اسرائیل کہلاتی ہے۔ بنی اسرائیل میں آج سے تقریباً ساڑھے تین ہزار سال پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعے بنی اسرائیل کو اپنی شریعت سے نوازا۔ موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے ملاقات کے لیے کوہِ طور پر گئے تو وہاں انہوں نے چالیس دن کا روزہ رکھا تھا۔ تورات میں موسیٰ علیہ السلام کے اس روزے کا ذکر اس طرح سے آیا ہے:

> ''اور موسیٰ خداوند کے پاس چالیس دن اور چالیس رات رہا۔ نہ روٹی کھائی اور نہ پانی پیا۔ اور اس نے عہد کا کلام' دس احکام دو لوحوں پر لکھے۔''(۱۱)

تورات میں یہودیوں پر عاشورے کے روزے کا ذکر ان الفاظ میں ہے:

> ''یہ تمہارے لیے ابدی فرض ہوگا کہ ساتویں مہینے کی دسویں تاریخ کو تم میں سے ہر ایک' کیا دیسی کیا پردیسی' نفس کشی کرے (روزہ رکھے) اور کوئی کام نہ کرو' کیونکہ اس روز تمہاری پاکیزگی کے لیے تمہارے واسطے کفّارہ دیا جائے گا۔ تب تم اپنے سارے گناہوں سے خداوند کے آگے پاک ہو جاؤ گے۔ یہ تمہارے لیے تعطیل کا سبت ہوگا۔ اس دن تم نفس کشی کرو (روزہ رکھو) یہ ابدی فرض ہوگا۔''(۱۲)

عاشورہ کا یہ روزہ غروب آفتاب سے شروع ہوتا ہے اور تقریباً ۲۵ گھنٹے بعد اگلے روز رات کے شروع ہونے تک رہتا ہے۔ اس روزے کے دوران کھانے پینے اور میاں بیوی کے درمیان جنسی تعلق سے مکمل پرہیز کیا جاتا ہے۔ چمڑے کے جوتے جو آرام اور آسائش کی علامت ہیں' کا پہننا بھی اس روزے میں ممنوع ہے۔ یہودی اپنا بیش تر وقت صومعہ (یہودیوں کی عبادت گاہ) میں

گزارتے ہیں اور دن کے آخر میں خاص طور پر خدا تعالیٰ سے توبہ و استغفار کرتے ہیں۔ روزے کے دوران خمسہ موسیٰ، یونس کی کتاب اور دیگر احوال و واقعات پڑھے جاتے ہیں۔ (۱۳)

اس کے علاوہ یہود میں اپنے بڑے لوگوں کے یوم وفات پر روزہ رکھنے کا رواج بھی پایا جاتا ہے۔ مثلاً آذار کے مہینے کی سات تاریخ کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا انتقال ہوا، یہودی اس دن روزہ رکھتے ہیں۔

## عیسائیت میں روزہ کا تصور

یہود کے بعد نصاریٰ کے یہاں بھی ہمیں روزے کا وجود پوری شان سے ملتا ہے۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کوہِ طور پر چالیس دن کا روزہ رکھا تھا اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی چالیس دن رات کا روزہ رکھا تھا۔ بائبل میں اس کا تذکرہ ان الفاظ میں ملتا ہے:

''اور جب وہ چالیس دن اور چالیس رات روزہ رکھ چکا، آخر کار بھوکا ہوا۔'' (۱۴)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے روزے کے بارے میں اپنے حواریوں کو یہ ہدایت دی:

''اور جب تم روزہ رکھو تو ریاکاروں کی مانند اپنا چہرہ اداس نہ بناؤ، کیونکہ وہ مُنہ بگاڑتے ہیں تاکہ لوگ انہیں روزہ دار جانیں۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وہ اپنا اجر پا چکے۔ لیکن جب تو روزہ رکھے سر پر تیل لگا اور مُنہ دھو تاکہ آدمی نہیں، بلکہ تیرا باپ جو پوشیدگی میں ہے، تجھے روزہ دار جانے اور تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے تجھے بدلہ دے گا۔'' (۱۵)

رومن کیتھولک کے ہاں Good Friday اور Ash Wednesday کے موقعوں پر جزوی روزے رکھنے کا رجحان اب بھی پایا جاتا ہے۔ ان روزوں کا پس منظر یہ ہے کہ عیسائی روایات کے مطابق بدھ کے دن صبح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو گرفتار کیا گیا تھا اور جمعہ کے دن سولی پر لٹکایا گیا تھا۔

عیسائیوں کے ہاں اور روزے بھی پائے جاتے تھے۔ مثلاً ایسٹر سے قبل وہ چالیس دنوں کے روزے رکھتے تھے۔ بہار کے موسم میں اچھی فصل کے لیے بھی روزے رکھے جاتے تھے۔

## عربوں کے دورِ جاہلیت میں روزہ کا تصور

نبی کریم ﷺ کی بعثت سے قبل اہلِ عرب کے ہاں بھی روزے کا واضح تصور موجود تھا۔ ''المفصّل فی تاریخ العرب قبل الاسلام'' میں ''صوم'' کے تحت جواد علی لکھتے ہیں:



''عربوں سے متعلق روایات میں یہ ہے کہ قریش یومِ عاشورہ کا روزہ رکھا کرتے تھے۔ اس دن وہ جمع ہوتے، عید مناتے اور کعبہ کو غلاف پہناتے تھے۔ اس روزے کی توجیہہ انہوں نے یہ بیان کی ہے کہ قریش اپنے دورِ جاہلیت میں کوئی بڑا گناہ کر بیٹھے تھے، اس گناہ کا انھوں نے بڑا بوجھ محسوس کیا تو انہوں نے اس گناہ کا کفّارہ دینے کا ارادہ کیا، چنانچہ انھوں نے اپنے لیے یوم عاشورہ کا روزہ مقرر کیا۔ وہ اس دن یہ روزہ اس بات پر شکرانے کے طور پر رکھتے تھے کہ خدا نے ان کو اس گناہ کے نتائج بد سے بچالیا۔ یہ بات بھی روایت کی گئی ہے کہ نبی ﷺ بھی نبوت سے پہلے یہ روزہ رکھا کرتے تھے۔'' (۱۶)

یوم عاشورہ کے اس روزے کی ایک دوسری توجیہہ یہ بیان کی گئی ہے کہ قریش کو ایک زمانے میں قحط نے آلیا تھا، پھر اللہ نے انہیں اس قحط سے نکال لیا تو انھوں نے خدا کا شکر ادا کرنے کے لیے روزہ رکھنا شروع کیا۔

عربوں میں چپ کے روزے سے متعلق ایک واقعہ روایت کیا گیا ہے کہ دورِ اسلام میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ احمس قبیلہ کی ایک عورت زینب کے پاس تشریف لائے۔ آپ نے دیکھا کہ وہ بات چیت نہیں کر رہی تو آپ نے لوگوں سے پوچھا کہ اسے کیا ہوا ہے، یہ بات کیوں نہیں کرتی؟ تو لوگوں نے بتایا کہ اس نے روزہ رکھا ہوا ہے۔ اس پر آپؓ نے اس سے کہا کہ گفتگو کر، کیونکہ یہ جائز نہیں، یہ تو دور جاہلیت کا عمل ہے۔ چنانچہ اس نے بات چیت شروع کر دی۔

ان معلومات سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اہلِ عرب بھی روزے سے مانوس تھے اور نبی اکرم ﷺ بھی بعثت سے قبل روزے رکھا کرتے تھے۔

اس تفصیلی مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ روزہ یعنی مذہبی بنیادوں پر کھانے پینے سے اجتناب ایک ایسا آفاقی عمل ہے جس سے مشرق و مغرب کی تقریباً سب تہذیبیں اور سب مذاہب متعارف رہے ہیں۔ کسی کے ہاں یہ جزوی شکل میں ہے اور کسی کے ہاں مکمل شکل میں۔ کوئی اس میں حد اعتدال سے بڑھا ہوا ہے اور اس نے عام آدمی کے لیے اسے ناممکن بنا دیا ہے اور کسی نے اسے بہت آسان بنا رکھا ہے۔ بہر حال سبھی لوگ اس مذہبی عمل سے متعارف ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ اس عمل کے اپنے کچھ خاص غیر مادی اثرات ہیں۔

## روزہ کی آفاقیت بیان کرنے کا مقصد

روزہ کی تاریخ اور اس کی آفاقی حیثیت کو ثابت کرنے کا اصل مقصد اس بات کی وضاحت ہے کہ نماز اور زکوٰۃ کی طرح روزہ بھی قرآن حکیم کے مخاطبین کے لیے کوئی اجنبی چیز نہ

تھی۔ وہ اِس کی مذہبی حیثیت اور اِس کے حدود و شرائط سے پوری طرح واقف تھے۔ چنانچہ قرآن نے جب اِس کا حکم دیا تو اس کے حدود و شرائط میں سے کسی چیز کو بھی بیان نہیں کیا' بلکہ ہدایت فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کے ایک قدیم حکم اور انبیاء علیہم السلام کی ایک قدیم سنت کے طور پر' جس طرح اسے جانتے ہیں' ایک لازمی عبادت کے طور پر اِس کا اہتمام کریں۔ نبی ﷺ اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے اِسی کے مطابق روزہ رکھا اور مسلمان نسلاً بعد نسلٍ اب اِسی طریقے کی پیروی کر رہے ہیں۔ اِس لحاظ سے روزے کا ماخذ بھی اصلاً مسلمانوں کا اجماع اور اُن کا عملی تواتر ہی ہے۔

# اِسلام میں روزہ کا حکم اور اس کی فضیلت

اسلام میں ہجرت کے ڈیڑھ سال اور تحویلِ قبلہ کے بعد دس شعبان کو روزے فرض ہوئے اور یہ آیت کریمہ نازل ہوئی:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝١٨٣﴾ (البقرة)

مؤرخین بھی اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ ہجرتِ مدینہ کے دوسرے سال اٹھارہویں مہینہ شعبان کے نصف میں فرضیتِ صوم کا حکم آیا۔ (بحوالہ تاریخ ابن خلدون' تاریخ طبری)

روزہ کی فضیت کے حوالے سے ایک بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ روزہ مسلمانوں پر اس لیے فرض نہیں کیا گیا کہ مسلمان اُس وقت فاقوں کا شکار تھے' بلکہ اصولِ اسلام کی رو سے فاقہ مستوں کو روزہ کی جتنی ضرورت ہے شکم سیروں کے لیے وہ اس سے زیادہ ضروری ہے۔ تو یہ کہنا درست نہیں کہ ''آغازِ اسلام میں چونکہ مسلمانوں کو اکثر فاقوں سے دوچار ہونا پڑتا تھا اس لیے ان کو روزوں کا خوگر بنا دیا گیا''۔ اگر ایسا ہوتا تو ظہورِ اسلام کے فوراً بعد ہی مکی زندگی میں روزہ فرض ہو جاتا کہ یہ اُس وقت مسلمانوں کی مالی حالت کے اعتبار سے موزوں ہو سکتا تھا' مگر ایسا نہ ہوا' بلکہ روزہ وسطِ اسلام میں اور ہجرت کے بعد فرض کیا گیا۔

## صوم کے لغوی معنی

صوم اور صیام دونوں مصدر کے صیغے ہیں' صَامَ يَصُوْمُ صَوْمًا وَصِيَامًا۔ عربی زبان میں صوم کہتے ہیں کسی چیز سے رک جانا اور چھوڑ جانا۔ ''صَامَ الْفَرَسُ صَوْمًا'' کے معنی ہیں



گھوڑے نے چارہ نہیں کھایا۔ روزہ دار کو صائم اس لیے کہتے ہیں کہ وہ کھانے پینے اور عملِ تزویج سے خود کو روک لیتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے قبل عربوں کے ہاں صوم اور صائم مانوس الفاظ تھے۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ ''بیان القرآن'' میں اس بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

''عربوں کے ہاں صوم یا صیام کے لفظ کا اطلاق اور مفہوم کیا تھا اور اس سے وہ کیا مراد لیتے تھے' اسے ذرا سمجھ لیجیے! عرب خود تو روزہ نہیں رکھتے تھے' البتہ اپنے گھوڑوں کو رکھواتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اکثر عربوں کا پیشہ غارت گری اور لوٹ مار تھا۔ پھر مختلف قبائل کے مابین وقفہ وقفہ سے جنگیں ہوتی رہتی تھیں۔ ان کاموں کے لیے ان کو گھوڑوں کی ضرورت تھی اور گھوڑا اس مقصد کے لیے نہایت موزوں جانور تھا کہ اس پر بیٹھ کر تیزی سے جائیں' لوٹ مار کریں' شب خون ماریں اور تیزی سے واپس آ جائیں۔ اونٹ تیز رفتار جانور نہیں ہے' پھر وہ گھوڑے کے مقابلے میں تیزی سے اپنا رُخ بھی نہیں پھیر سکتا۔ مگر گھوڑا جہاں تیز رفتار جانور ہے' وہاں تنک مزاج اور نازک مزاج بھی ہے۔ چنانچہ وہ تربیت کے لیے ان گھوڑوں سے یہ مشقت کراتے تھے کہ ان کو بھوکا پیاسا رکھتے تھے اور ان کے مُنہ پر ایک ''توبڑا'' چڑھا دیتے تھے۔ اس عمل کو وہ ''صوم'' کہتے تھے اور جس گھوڑے پر یہ عمل کیا جائے اسے ''صائم'' کہتے تھے' یعنی یہ روزہ سے ہے۔''(۱۷)

## صوم کی شرعی تعریف

صاحبِ ''ہدایہ'' نے صوم کی شرعی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

اَلصَّوْمُ هُوَ الْاِمْسَاكُ عَنِ الْاَكْلِ وَ الشُّرْبِ وَ الْجِمَاعِ نَهَارًا مَعَ النِّيَّةِ فِي الشَّرْعِ (۱۸)

''روزہ شریعت کے اندر نیت کے ساتھ دن بھر کھانے پینے اور تعلقِ مرد وزن سے رُکے رہنے کا نام ہے۔''

صاحبِ تفسیر قرطبی نے صوم کی شرعی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

الامساك عن المفطرات مع اقتران النية به من طلوع الفجر الى غروب الشمس (۱۹)

''روزے کی نیت کے ساتھ طلوعِ فجر سے غروبِ آفتاب تک ہر قسم کے مفطرات سے رُک جانا۔''

## لفظ رمضان کے لغوی معنی

رمضان ''رمض'' کا مصدر ہے۔اس کا لغوی معنی ہے دھوپ سے تپتی ہوئی زمین' تپتی ہوئی ریت۔علماء کرام لکھتے ہیں کہ جب رمضان کا نام رکھا گیا شدت کی گرمی پڑ رہی تھی۔بعض علماء کا کہنا ہے کہ رمضان ''رمضاء'' سے لیا گیا ہے۔رمضاء خریف کی اس بارش کو کہتے ہیں جو زمین سے گرد وغبار کو دھوڈالتی ہے' اسی طرح رمضان بھی اُمتِ محمدیہ کے گناہ دھوڈالتا ہے اور ان کے دلوں کو پاک کر دیتا ہے۔

## روزوں کے لیے ماہِ رمضان کا انتخاب

یہاں یہ بات بھی نوٹ کر لیجیے کہ روزے جس ماہ میں بھی فرض ہوتے اس سے روزے کا مقصد (ضبطِ نفس) پورا ہو جاتا' لیکن روزوں کے لیے ماہِ رمضان کو اس لیے منتخب کیا گیا کہ اس ماہ مبارک میں قرآن کا نزول ہوا ہے:

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰی وَالْفُرْقَانِ ۚ﴾ (البقرۃ:۱۸۵)

''رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا لوگوں کے لیے ہدایت بنا کر اور ہدایت اور حق و باطل کے درمیان امتیاز کی روشن دلیلوں کے ساتھ۔''

متعدد احادیث میں روزہ اور قرآن کے باہمی تعلق کی طرف واضح اشارات موجود ہیں۔مثلاً:

(۱) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَنْ صَامَ رَمَضَانَ اِیْمَانًا وَّاِحْتِسَابًا غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ وَ مَنْ قَامَ رَمَضَانَ اِیْمَانًا وَّاِحْتِسَابًا غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ)) (۲۰)

''جو لوگ رمضان کے روزے ایمان واحتساب کے ساتھ رکھیں گے ان کے سب گزشتہ گناہ معاف کر دیے جائیں گے اور اسی طرح جو لوگ ایمان واحتساب کے ساتھ رمضان (کی راتوں) میں قیام کریں گے (اور اس میں قرآن پڑھیں گے اور سنیں گے) تو ان کے بھی سب گزشتہ گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔''

(۲) حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اَلصِّیَامُ وَالْقُرْآنُ یَشْفَعَانِ لِلْعَبْدِ یَوْمَ الْقِیَامَةِ' یَقُوْلُ الصِّیَامُ :اَیْ رَبِّ اِنِّیْ مَنَعْتُهُ الطَّعَامَ وَالشَّهَوَاتِ بِالنَّهَارِ فَشَفِّعْنِیْ فِیْهِ ' وَیَقُوْلُ الْقُرْآنُ : مَنَعْتُهُ



النَّوْمَ بِاللَّیْلِ فَشَفِّعْنِیْ فِیْهِ ' فَیُشَفَّعَانِ)) (۲۱)

''روزہ اور قرآن دونوں قیامت کے دن بندے کی سفارش کریں گے۔روزہ عرض کرے گا: اے میرے پروردگار! میں نے اس بندے کو دن کے اوقات میں کھانے پینے اور نفس کی خواہش کو پورا کرنے سے روکے رکھا تھا' آج میری سفارش اس کے حق میں قبول فرما۔اور قرآن کہے گا: میں نے اس کو رات کے سونے اور آرام کرنے سے روکے رکھا تھا' آج میری سفارش اس کے حق میں قبول فرما۔چنانچہ (روزہ اور قرآن) دونوں کی سفارش اس بندہ کے حق میں قبول فرمائی جائے گی۔''

## اسلام میں روزہ کی فضیلت

جملہ عبادات میں سے روزہ وہ واحد عبادت ہے جس کے بارے میں احادیث میں یہ الفاظ آئے ہیں:

((اَلصَّوْمُ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِهٖ)) (۲۲)

''روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا۔''

بعض لوگوں نے اعراب کے تھوڑے سے فرق سے ((اَلصَّوْمُ لِیْ وَاَنَا اُجْزٰی بِهٖ)) اس کا معنی یہ کیا ہے: ''روزہ میرے لیے ہے اور میں (میری ذات) ہی اس کا بدلہ ہوں۔''

روزہ داروں کے لیے جنت کا ایک دروازہ مخصوص ہے جس میں سے صرف روزہ دار ہی داخل ہوں گے' اُن کے علاوہ کوئی اور اس دروازہ سے داخل نہیں ہوگا۔حضرت سہل بن سعد سعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اِنَّ فِی الْجَنَّةِ بَابًا یُقَالُ لَهُ الرَّیَّانُ یَدْخُلُ مِنْهُ الصَّائِمُوْنَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ' لَا یَدْخُلُ مِنْهُ اَحَدٌ غَیْرَ هُمْ' یُقَالُ: اَیْنَ الصَّائِمُوْنَ ؟ فَیَقُوْمُوْنَ' لَایَدْخُلُ مِنْهُ اَحَدٌ غَیْرُهُمْ' فَاِذَا دَخَلُوْا اُغْلِقَ فَلَمْ یَدْ خُلْ مِنْهُ اَحَدٌ)) (۲۳)

''یقیناً جنت میں ایک دروازہ ہے جسے ''ریان'' (تروتازگی) کہا جاتا ہے' اُس دروازہ سے قیامت کے دن روزے دار داخل ہوں گے' ان کے علاوہ کوئی اُس سے داخل نہیں ہوگا۔کہا جائے گا کہاں ہیں روزے دار؟ تو وہ کھڑے ہو جائیں گے۔اس دروازے سے ان کے علاوہ کوئی اور داخل نہ ہوگا۔پس جب وہ داخل ہو جائیں گے تو دروازہ بند کر دیا جائے گا اور کوئی اس میں داخل نہ ہو سکے گا۔''

ان کے علاوہ روزے کے فضائل سے متعلق متعدد احادیث ہیں، جن کا تذکرہ طوالت کی وجہ سے نہیں کیا گیا۔

## اسلام میں روزہ میں حدِّ اعتدال

اسلام میں باقی مذاہب اور تہذیبوں کے برعکس روزہ کو حد اعتدال پر رکھا ہے۔ اس بارے میں خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ﴾ (البقرۃ:۱۸۵)

''اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی کا ارادہ کرتا ہے اور تنگی کا ارادہ نہیں کرتا۔''

اسلام میں روزہ کے متعلق درج ذیل آسانیاں رکھی گئی ہیں۔ ① پورے سال میں سے صرف ایک ماہ یعنی ۲۹ یا ۳۰ دن کے روزے فرض کیے گئے ہیں: ﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾ (البقرۃ:۱۸۵) ''جو شخص بھی تم میں سے اس ماہ کو پائے تو وہ اس میں روزہ رکھے''۔ ② روزہ کے اوقات میں بھی حد اعتدال کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ صبح صادق سے غروبِ آفتاب تک روزہ کا وقت ہے، جبکہ رات کے اوقات میں روزہ نہیں ہے: ﴿وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ﴾ (البقرۃ:۱۸۷) ''اور کھاؤ پیو یہاں تک کہ واضح ہو جائے تمہارے لیے فجر کی سفید دھاری (رات کی) سیاہ دھاری سے، پھر رات تک روزے کو پورا کرو''۔ ③ رات کے اوقات میں حق زوجیت کی رخصت دی گئی: ﴿اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ﴾ (البقرۃ:۱۸۷) ''حلال کر دیا گیا ہے تمہارے لیے روزے کی راتوں میں بے حجاب ہونا اپنی بیویوں سے''۔ یہودیت اور عیسائیت میں رات کے اوقات میں بھی کھانے پینے اور حقِّ زوجیت ادا کرنے کی ممانعت تھی۔ ④ مریض اور مسافر کی سہولت کے لیے اسے رخصت دی گئی ہے: ﴿فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ﴾ (البقرۃ:۱۸۴) ''اس پر بھی جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا سفر پر ہو تو وہ تعداد پوری کر لے دوسرے دنوں میں''۔ ⑤ بھول کر کھا پی لینے سے روزہ پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ قرآن مجید کی عظیم ترین دعا ہے: ﴿رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا﴾ (البقرۃ:۲۸۶) ''اے ہمارے ربّ! ہم سے مؤاخذہ نہ فرمانا اگر ہم بھول جائیں یا ہم سے خطا ہو جائے''۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:



((مَنْ نَسِيَ وَهُوَ صَائِمٌ فَاَكَلَ اَوْ شَرِبَ فَلْيُتِمَّ صَوْمَهُ، فَاِنَّمَا اَطْعَمَهُ اللّٰهُ وَسَقَاهُ)) (۲۴)

''جس نے روزہ کی حالت میں بھول کر کچھ کھا پی لیا تو وہ قاعدہ کے مطابق اپنا روزہ پورا کرے، کیونکہ اس کو اللہ نے کھلایا اور پلایا ہے۔''

# روزے کے متعلق جدید فقہی مسائل

بعض چیزیں ایسی ہیں جن کے بارے میں ہمارے معاشرے میں شبہ پایا جاتا ہے کہ اس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے یا مکروہ ہو جاتا ہے، لیکن درحقیقت اُن چیزوں سے روزہ پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس سلسلے میں چند مسائل کا حکم ذیل میں بیان کیا جاتا ہے۔

## روزہ میں انجکشن، گلوکوز یا خون لگانا

روزہ کی حالت میں گوشت یا رگ میں انجکشن، گلوکوز یا خون لگوانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا، لیکن بلا عذر اور طاقت کے لیے ان کے استعمال سے روزہ مکروہ ہو جاتا ہے۔ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی رقم طراز ہیں:

''انجکشن کے ذریعہ چاہے خون پہنچایا جائے یا دوا، مُفسدِ صوم نہ ہوگا۔ چونکہ گلوکوز وغیرہ کی نوعیت بھی یہی ہوتی ہے کہ رگوں کے واسطے سے پہنچایا جاتا ہے، معدہ یا دماغ کے کسی منفذ کے ذریعہ نہیں پہنچایا جاتا، اس لیے روزہ نہیں ٹوٹے گا۔'' (۲۵)

مولانا محمد یوسف لدھیانوی اس بارے میں سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:

''عذر کی وجہ سے رگ میں بھی انجکشن لگانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا، صرف طاقت کا انجکشن لگوانے سے روزہ مکروہ ہو جاتا ہے۔ گلوکوز کے انجکشن کا بھی یہی حکم ہے۔'' (۲۶)

اسی طرح خون دینے یا خون نکلنے سے بھی روزہ پر کوئی فرق نہیں پڑتا، البتہ اگر خون منہ سے نکلے اور حلق میں چلا جائے تو اس سے روزہ ٹوٹ جائے گا۔ مولانا یوسف لدھیانوی اس بارے میں لکھتے ہیں: ''خون دینے سے روزہ نہیں ٹوٹتا..... خون نکلنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔'' (۲۷)

## روزے کی حالت میں مسواک، برش، ٹوتھ پاؤڈر اور ٹوتھ پیسٹ کا حکم

روزہ کی حالت میں مسواک کرنے سے روزہ مکروہ نہیں ہوتا، چاہے وہ مسواک خشک ہو یا تر۔ حضرت عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

((رَاَیْتُ النَّبِیَّ ﷺ مَا لَا اُحْصِیَ یَتَسَوَّکُ وَھُوَ صَائِمٌ))(۲۸)

''میں نے نبی کریم ﷺ کو اَن گنت بار روزے کی حالت میں مسواک کرتے ہوئے دیکھا ہے۔''

صاحبِ ہدایہ اس بارے میں لکھتے ہیں:

''روزہ دار کے لیے صبح وشام تر مسواک کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے' اس لیے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے کہ روزہ دار کی بہترین خصلت مسواک ہے۔''(۲۹)

اسی طرح بغیر ٹوتھ پیسٹ کے برش سے دانت صاف کرنے کا بھی مسواک والا حکم ہے' لیکن روزے کی حالت میں ٹوتھ پیسٹ اور ٹوتھ پاؤڈر کا استعمال مکروہ ہے۔ مولانا محمد یوسف لدھیانوی لکھتے ہیں:

''ٹوتھ پیسٹ کا استعمال روزے کی حالت میں مکروہ ہے۔''(۳۰)

البتہ کسی عذر کی بنا پر ٹوتھ پاؤڈر اور پیسٹ کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی اس سلسلے میں رقم طراز ہیں:

''.....لیکن ٹوتھ پاؤڈر اور پیسٹ کا حال اس سے مختلف ہے' اس لیے کہ اس میں بہت محسوس ذائقہ ہوتا ہے اور مسواک کا نہ اس پر اطلاق ہوتا ہے اور نہ مسواک کی سنت ادا کرنے کے لیے اس کی ضرورت ہے۔ اس لیے کسی ضرورتِ شدیدہ کے بغیر اس کا استعمال کراہت سے خالی نہ ہوگا۔ ہاں عذر کی بنا پر کیا جاسکتا ہے جیسا کہ فقہاء کی اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے: **وکرہ ذوق شیئ ومضغہ بلا عذر** (کسی چیز کا چکھنا اور چبانا بلا عذر مکروہ ہے)۔''(۳۱)

## روزہ کی حالت میں آنکھ میں سُرمہ یا دوائی ڈالنے کا حکم

روزہ کی حالت میں آنکھ میں سرمہ ڈالنے یا دوائی ڈالنے (چاہے وہ دوائی سیال کیوں نہ ہو) سے روزے پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

**اکْتَحَلَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ وَھُوَ صَائِمٌ** (۳۲)

''رسول اللہ ﷺ نے روزہ کی حالت میں سرمہ لگایا۔''

مولانا محمد یوسف لدھیانوی اس بارے میں لکھتے ہیں:

''آنکھ میں ڈالی گئی دوا براہ راست حلق یا دماغ تک نہیں پہنچتی' اس لیے اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔''(۳۳)



تاہم مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے اس بارے میں احتیاط کی ہدایت کی ہے:

''.....لیکن جدید میڈیکل سائنس کی تحقیق کے مطابق آنکھ میں ڈالی گئی سیال دوائی کا ذائقہ چونکہ حلق میں محسوس ہوتا ہے اس لیے احتیاط کے پیش نظر روزے کی حالت میں آنکھ میں دوائی ڈالنے سے پرہیز کریں.....''(۳۴)

## ناک اور کان میں دوائی ڈالنے کا حکم

کان اور ناک میں دوائی ڈالنے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے' اس لیے کہ اس دوائی کا براہِ راست اثر دماغ اور حلق تک پہنچتا ہے۔ مولانا محمد یوسف لدھیانوی لکھتے ہیں:

''.....لیکن ناک اور کان میں دوائی ڈالنے سے روزہ فاسد ہوجاتا ہے''۔(۳۵)

## امتحان اور کام کی وجہ سے روزہ چھوڑنا اور کسی دوسرے سے رکھوانے کا حکم

عموماً یہ بات مشاہدہ میں آئی ہے کہ والدین اپنے بچوں کو امتحانات کی وجہ سے روزہ رکھنے سے منع کرتے ہیں تاکہ وہ اپنی پڑھائی پر توجہ مرکوز رکھیں۔ اسی طرح جسمانی کام کرنے والے حضرات بھی اپنے کاموں کا بہانا بنا کر روزے سے دور بھاگتے ہیں۔ اس حوالے سے یہ بات ذہن نشین کرلیجیے کہ امتحانات یا کام کی وجہ سے روزہ چھوڑنا شریعت کی رو سے قطعاً جائز نہیں ہے۔ مولانا محمد یوسف لدھیانوی اس بارے میں لکھتے ہیں:

''کام کی وجہ سے روزے چھوڑنے کا حکم نہیں' البتہ مالکوں کو حکم دیا گیا ہے کہ رمضان میں مزدوروں اور کارکنوں کا کام ہلکا کردیں.....امتحان کے عذر کی وجہ سے روزہ چھوڑنا جائز نہیں ہے اور ایک شخص کی جگہ دوسرے کا روزہ رکھنا درست نہیں۔ نماز اور روزہ دونوں خالص بدنی عبادتیں ہیں' ان میں دوسرے کی نیابت جائز نہیں۔ جس طرح ایک شخص کے کھانا کھانے سے دوسرے کا پیٹ نہیں بھرتا' اسی طرح ایک شخص کے نماز پڑھنے یا روزہ رکھنے سے دوسرے کے ذمہ کا فرض ادا نہیں ہوتا۔''(۳۶)

## روزہ کی حالت میں دانت نکلوانا

روزہ کی حالت میں دانت نکلوانے سے روزہ پہ کوئی فرق نہیں پڑتا بشرطیکہ خون حلق میں نہ گیا ہو۔ اسی طرح اگر دانتوں سے خون نکلا ہے تو اس سے وضو تو ٹوٹ جائے گا مگر روزہ تب ٹوٹے گا جب خون حلق سے نیچے جائے گا۔ مولانا محمد یوسف لدھیانوی اس بارے میں لکھتے ہیں:

''دانت نکالنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا' بشرطیکہ خون حلق میں نہ گیا ہو.....اگر خون حلق سے نیچے چلا جائے تو روزہ ٹوٹ جائے گا۔''(۳۷)

## مرض کی وجہ سے روزہ چھوڑنا

اس بارے میں ایک اصول پیش نظر رکھنا چاہیے:

''جو شخص رمضان میں بیمار ہوا' پھر خوف کیا کہ اگر روزہ رکھا تو اس کا مرض بڑھ جائے گا تو وہ افطار کرے اور قضا کرے۔ اور امام شافعی نے فرمایا ہے کہ وہ افطار نہ کرے۔ ان کے نزدیک ہلاکت کے خوف یا عضو کے فوت ہونے کا اعتبار ہوگا.....'' (۳۸)

''مریض کو جب (روزہ کے باعث) ہلاکت یا کسی عضو کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو تو بالاتفاق روزہ توڑ دیا جائے گا۔ یہی حکم اس وقت بھی ہے جب بیماری بڑھ جانے یا طول پکڑ لینے کا اندیشہ ہو اور روزہ افطار کرنے کی صورت میں بعد میں اس کو قضا کرنی ہوگی۔ یہ اندیشہ خود مریض کے اندازہ پر مبنی ہوگا بشرطیکہ یہ اندازہ کسی مسلم طبیب کے مشورہ' تجربات یا علامات پر اس طرح مبنی ہو کہ مریض کو ان باتوں کا گمان غالب ہو جائے' محض وہم نہ ہو۔ صحت مند آدمی کو بھی اگر بیمار ہو جانے کا اندیشہ ہے تو اس کو بھی افطار کی اجازت ہے'' (۳۹)

مندرجہ بالا اقتباسات کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عام بیماری میں روزہ کی رخصت کا حکم نہیں ہے' صرف اس صورت میں ہے جب مرض کے بڑھ جانے کا ڈر ہو' جبکہ امام شافعی کے نزدیک تو جب موت یا کسی عضو کے ضائع ہونے کا ڈر ہو تو پھر روزہ افطار کیا جا سکتا ہے۔ افسوس کہ ہمارے زمانے میں ماہ مبارک کے آتے ہی کچھ لوگ مصنوعی بیماریوں کی ایک ڈھال لے کر بیٹھ جاتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ اللہ ان کی تمام چالوں سے آگاہ ہے: ﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝۴﴾ (التغابن) اسی طرح مخلوق کے ظاہری و پوشیدہ معاملات کو اللہ تعالیٰ سے زیادہ کون جان سکتا ہے: ﴿اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ۭ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ۝۱۴﴾ (الملک) ''کیا وہی نہ جانے گا جس نے پیدا کیا ہے؟ اور وہ بہت باریک بین اور باخبر ہے۔''

## شیخ فانی کے لیے افطار کی اجازت

شیخ فانی ایک فقہی اصطلاح ہے جو ایسے بوڑھے مرد یا بوڑھی عورتوں کے لیے استعمال ہوتی ہے جو عمر کے ایسے حصے میں پہنچ گئے ہوں کہ روز بروز ان کی کمزوری میں اضافہ ہی ہوتا جاتا ہے۔ ایسا شخص جب روزہ رکھنے سے عاجز ہو' یعنی نہ اب رکھ سکتا ہے نہ آئندہ اس میں اتنی طاقت آنے کی امید ہے کہ وہ روزہ رکھ سکے' تو اسے روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے اور ہر



روزے کے بدلے فدیہ دینے (یعنی ایک مسکین کو کھانا کھلانے) کا حکم ہے۔ فرمایا: ﴿وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ۭ﴾ (البقرۃ:۱۸۴) یہاں ''يُطِيْقُوْنَهٗ'' کے معنی بعض مفسرین نے ''لَا يُطِيْقُوْنَهٗ'' کے لیے ہیں۔ چنانچہ اس آیت کے معنی ہوں گے: ''اور جو اس کی طاقت نہ رکھتے ہوں ان پر فدیہ ہے ایک مسکین کا کھانا کھلانا''۔ یہ اسی طرح ہے جیسے فرمایا گیا: ﴿يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ۭ﴾ یہاں بھی ''اَنْ تَضِلُّوْا'' بمعنی ''اَنْ لَا تَضِلُّوْا'' ہے۔ تو اس آیت کا معنی ہوگا: ''اللہ تمہارے واسطے بیان کرتا ہے تاکہ تم بھٹک نہ جاؤ۔''

صاحبِ ہدایہ شیخ فانی کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''وہ بوڑھا کھوسٹ آدمی جو روزہ رکھنے پر قدرت نہ رکھتا ہو وہ افطار کرے اور ہر دن کے واسطے ایک مسکین کو کھانا کھلائے جیسا کہ کفارات میں دیا جاتا ہے..... اور اگر وہ روزہ پر قادر ہو گیا تو فدیہ کا حکم باطل ہو جائے گا کیونکہ خلیفہ ہونے کی شرط دائمی عجز ہے۔'' (۴۰)

شیخ فانی کے بارے میں چند باتیں نوٹ کر لیں: ① اگر ایسا بوڑھا یا بوڑھی جو گرمیوں میں گرمی کی شدت کی وجہ سے روزہ نہیں رکھ سکتے مگر سردیوں میں روزہ رکھنے کی قدرت ہو تو ایسے لوگ ماہ رمضان کے روزے افطار کریں اور ان روزوں کے بدلے ان کے لیے سردیوں میں روزے رکھنا فرض ہے۔ اس صورت میں روزوں کا کفارہ قابل قبول نہیں ہوگا۔ ② اگر شیخ فانی روزے کی طاقت نہیں رکھتا تھا اور اس نے روزوں کے بدلے فدیہ ادا کر دیا' کچھ عرصہ گزرنے کے بعد اس کی طاقت بحال ہو گئی تو اب اس کا فدیہ کالعدم شمار ہوگا اور وہ اپنے قضا شدہ روزوں کی قضا کرے گا۔ ③ ہمارے معاشرے میں اس حوالے سے ایک غلط بات رواج پا گئی ہے کہ شیخ فانی کسی غریب مسکین کو رقم دے کر اس سے اپنے روزے رکھواتا ہے' یعنی اسے کہتا ہے کہ یہ رقم لے لو اور میرے بدلے روزے تم رکھو۔ یہ صریحاً غلط ہے' اس لیے کہ روزہ نماز کی طرح ایک بدنی عبادت ہے' اس میں کوئی کسی کی نیابت نہیں کر سکتا۔

## سفر میں روزہ رکھنا

قرآنی آیت سے مرض اور سفر میں روزہ نہ رکھنے کی رخصت ملتی ہے اور یہ سب بندوں کی سہولت اور آسانی کے لیے اور تنگی اور دشواری سے بچانے کے لیے ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا طرزِ عمل چونکہ اُمت کے لیے اُسوہ اور نمونہ ہے اس لیے آپ ﷺ نے کبھی سفر میں روزہ رکھا اور کبھی افطار کیا تاکہ اُمتی اپنے حالات کے مطابق عمل کر سکیں۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے

روایت ہے کہ حمزہ بن عمرو اسلمی رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ میں سفر میں روزہ رکھ لیا کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

((اِنْ شِئْتَ فَصُمْ وَاِنْ شِئْتَ فَاَفْطِرْ)) (۴۱)

''چاہو تو روزہ رکھو اور چاہو تو افطار کرو۔''

دوسری روایت میں نبی کریم ﷺ کے عمل کا تذکرہ موجود ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مِنَ الْمَدِيْنَةِ اِلٰى مَكَّةَ فَصَامَ حَتّٰى بَلَغَ عُسْفَانَ ثُمَّ دَعَا بِمَاءٍ فَرَفَعَهُ اِلٰى يَدِهٖ لِيُرَاهُ النَّاسُ فَاَفْطَرَ حَتّٰى قَدِمَ مَكَّةَ وَذٰلِكَ فِيْ رَمَضَانَ (۴۲)

''رسول اللہ ﷺ مدینہ سے مکہ کی طرف روانہ ہوئے، تو راستے میں آپؐ نے برابر روزے رکھے، یہاں تک کہ مقام عسفان تک پہنچ گئے۔ پھر آپؐ نے پانی کا پیالہ منگوایا اور اس پیالہ کو اوپر اٹھایا تاکہ سب دیکھ لیں، پھر آپؐ نے روزہ کھول دیا۔ پھر مکہ پہنچنے تک آپؐ نے روزے نہیں رکھے، اور یہ ماہِ رمضان کا واقعہ ہے۔''

اس بارے میں آپ ﷺ کے ارشادات اور طرزِ عمل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سفر میں روزہ رکھنے سے اگر دوسرے ضروری کاموں کا حرج اور نقصان ہوتا ہو یا دورانِ سفر روزہ مشقت کا باعث بنے تو افطار کرنا بہتر ہے، اور اگر ایسی بات نہ ہو تو پھر ''اَلصَّوْمُ فِي السَّفَرِ اَفْضَلُ''، یعنی سفر میں روزہ رکھنا بہتر ہے۔ صاحبِ ہدایہ نے سفر کی رخصت کو مشقت پر محمول کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''اگر مسافر روزے سے ضرر محسوس نہ کرتا ہو تو اس کا روزہ رکھنا افضل ہے اور اگر افطار کیا تو جائز ہے کیونکہ سفر مشقت سے خالی نہیں ہوتا۔'' (۴۳)

موجودہ زمانے میں، جب بے شمار سفری سہولتیں میسّر ہیں اور سفر میں کوئی مشقت پیش نہیں آتی، بلاوجہ سفر کو عذر بنا کر افطار کرنا مناسب نہیں۔

**نوٹ:** اگر سفر یا مرض کے باعث کوئی روزہ چھوٹ جائے تو اس کی قضا لازم ہے۔ قرآن نے مریض اور مسافر کو اپنے روزوں کی گنتی دوسرے ایام میں پوری کرنے کی تلقین کی ہے۔ فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ﴾ ''پس جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا سفر پر ہو تو وہ تعداد پوری کرلے دوسرے دنوں میں۔''



## حواشی

(۱) صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب بنی الاسلام علی خمس۔ وصحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان ارکان الاسلام۔

(۲) صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الا یمان والاسلام والاحسان۔

(3) Encyclopedia of Religion, under Fasting.

(4) Encyclopedia Britannica, under Fasting.

(5) The Jewish Encyclopedia, under Fasting and Fast days .

(6) A hand book of living religions by John. R.Hinndls, under Hinduism.

(۷) سیرت النبی ﷺ، ج۵، ص ۲۴۲۔

(۸) سیرت النبی ﷺ، ج۵، ص ۲۴۲۔

(9) Encyclopedia of Religions and Ethics, under Fasting.

(۱۰) کتاب یونس، باب۳، آیت ۵ تا ۹۔

(۱۱) کتاب خروج، باب ۳۴، آیت ۲۸۔

(۱۲) کتاب الاحبار، باب ۱۶، آیات ۲۹ تا ۳۱۔

(13) A hand book of living religions by John. R.Hinndls, under Judaism.

(۱۴) کتاب متی، باب۲، آیت ۴۔

(۱۵) کتاب متی، باب ۱۶، آیات ۶ تا ۱۸۔

(۱۶) المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام، ج۶، ص ۳۳۹۔۳۴۰۔

(۱۷) بیان القرآن، ج۱، ص ۳۸۳، اشاعت نومبر ۲۰۰۸ء۔

(۱۸) بحوالہ اشرف الھدایہ، شرح اردو، ھدایہ، ج۳، ص ۲۰۳۔

(۱۹) تفسیر القرطبی، ج۱، جزء ثانی، ص ۱۸۴، طبع دارالکتب العلمیۃ بیروت لبنان۔

(۲۰) صحیح البخاری، کتاب صلاۃ التراویح، باب فضل لیلۃ القدر۔ وصحیح مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین وقصرھا، باب فی قیام رمضان وھو التراویح۔

(۲۱) رواہ البیھقی فی شعب الایمان۔ و مسند احمد، : ح ۶۳۳۷۔

(۲۲) صحیح البخاری، وصحیح مسلم۔ وجامع الترمذی، کتاب الصوم، باب ما جاء فی فصل الصوم۔

(۲۳) صحیح البخاری، کتاب الصیام، باب الریان للصائمین۔ وصحیح مسلم، کتاب الصیام، باب فضل الصیام۔
(۲٤) صحیح البخاری، کتاب الصوم، باب الصائم اذا اکل او شرب ناسیا۔ وصحیح مسلم، کتاب الصیام، باب اکل الناسی وشربہ وجماعہ لا یفطر۔ وللفظ لہ۔
(۲٥) جدید فقہی مسائل، ص ۹۷۔
(۲٦) آپ کے مسائل اور ان کا حل، ج۳، ص ۳۷۱۔
(۲۷) آپ کے مسائل اور ان کا حل، ج۳، ص ۳۷۱،۳۷۲۔
(۲۸) جامع الترمذی، باب الصوم عن رسول اللہ ﷺ، باب ماجاء فی السواک للصائم۔
(۲۹) بحوالہ اشرف الہدایہ، شرح اردو ،ہدایہ، ج۳، ص ۲۲۹۔
(۳۰) آپ کے مسائل اور ان کا حل، ج۳، ص ۳۷۳۔
(۳۱) جدید فقہی مسائل، ص ۱۰۱۔
(۳۲) سنن ابن ماجہ، کتاب الصیام، باب ما جاء فی السواک والکحل للصائم۔
(۳۳) آپ کے مسائل اور ان کا حل، ج۳، ص ۳٦۸۔
(۳٤) بحوالہ جدید فقہی مسائل، ص ۱۰۰۔
(۳٥) آپ کے مسائل اور ان کا حل، ج۳، ص ۳٦۸۔
(۳٦) آپ کے مسائل اور ان کا حل، ج۳، ص ۳٥۲۔۳٥۱۔
(۳۷) آپ کے مسائل اور ان کا حل، ج۳، ص ۳۷۲۔
(۳۸) بحوالہ اشرف الہدایہ، شرح اردو ہدایہ، ج۳، ص ۲۳۱۔
(۳۹) الفتاوی الہندیہ، ج۱، ص ۱۰٦۔ بحوالہ جدید فقہی مسائل، ص ۱۰۱۔
(٤۰) بحوالہ اشرف الہدایہ، شرح اردو ہدایہ، ج۳، ص ۲۳۹۔
(٤۱) صحیح البخاری، کتاب الصوم، باب الصوم فی السفر والافطار۔وصحیح مسلم، کتاب الصیام، باب التخییر فی الصوم والفطر فی السفر۔
(٤۲) صحیح البخاری، کتاب الصوم، باب افطر فی السفر لیراہ الناس۔
(٤۳) بحوالہ اشرف الہدایۃ، شرح اردو ہدایہ، ج۳، ص ۲۲۹۔

# روزہ میں آسانیاں

حافظ محمد مشتاق ربانی

اللہ تعالیٰ نے دین کو نہایت آسان بنایا ہے تاکہ اس کے بندوں کو دین پر چلنے میں دشواری نہ ہو۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے: ﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ﴾ (الحج:۷۸) ''اور اس نے تم پر دین (کی کسی بات) میں تنگی نہیں کی''۔ حَرَج اسم نکرہ ہے اور اس سے پہلے مِنْ حرفِ جار ہے' مراد یہ ہے کہ تم پر کسی بھی قسم کی کوئی تنگی نہیں رکھی۔ صحیح بخاری میں روایت ہے: ((اِنَّ الدِّيْنَ يُسْرٌ)) ''بے شک دین اسلام میں آسانیاں پائی جاتی ہیں''۔ اس نقطۂ نظر سے اگر ہم اسلامی عبادات اور قوانین کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی ادائیگی کی خاطر ہمارے لیے طرح طرح کی سہولتیں رکھی ہیں' جن سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ آیئے روزہ کے باب میں دیکھتے ہیں کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے کیا رخصتیں رکھی ہیں اور کن مشکلات سے ہمیں بچایا ہے۔ روزے کے تذکرہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ؗ﴾ (البقرۃ:۱۸۵) ''اللہ تعالیٰ تمہارے حق میں آسانی چاہتا ہے اور سختی نہیں چاہتا''۔ يُرِيْدُ یہاں يُحِبُّ کے معنی میں ہے' یعنی پسند کرتا ہے۔ يُرِيْدُ فعل مضارع ہے جس میں دوام واستمرار کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ بندوں کے ساتھ آسانی کا ارادہ فرماتے ہیں۔ روزے میں آسانیاں کہاں ہیں؟ اس کے لیے روزے کی بابت وارد ہونے والی سورۃ البقرۃ کی آیات اور فقہ اسلامی سے استفادہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اس بارے میں مندرجہ ذیل مواقع نظر آتے ہیں' جب ایک مسلمان کو روزہ میں سہولت وآسانی ملتی ہے۔

## (۱) مرض اور سفر

مریض اور مسافر کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے باقاعدہ ذکر کیا ہے کہ انہیں دورانِ مرض اور دورانِ سفر روزہ نہ رکھنے کی رخصت ہے۔ ارشاد ہے:



﴿فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ﴾

(البقرۃ:۱۸۵)

''اور جو بیمار ہو یا سفر میں ہو تو دوسرے دنوں میں (روزہ رکھ کر) شمار پورا کرے۔''

یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رخصت ہے' لیکن اگر کسی نے مرض اور سفر میں روزہ رکھ لیا تو اس کا روزہ فضیلت کا باعث ہوگا' کیونکہ قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ (البقرۃ:۱۸۵) ''اور روزہ رکھنا تمہارے حق میں بہتر ہے''۔ بہرحال معلوم ہوا کہ بیماری اور سفر کی حالت میں بھی روزہ میں صرف رخصت دی گئی ہے۔ مرض ایسا ہو کہ اگر اس میں روزہ رکھا تو مرض اور بڑھ جائے گا۔ البتہ سفر کی مسافت میں فقہاء کا اختلاف ہے۔

## (۲) الھرم (انتہائی بڑھاپا)

شیخ فانی اور عجوز فانیہ کو رخصت ہے کہ روزہ نہ رکھیں۔ یہ بڑھاپے کی ایسی سٹیج پر ہوتے ہیں کہ سال میں کسی دن بھی روزہ رکھنے کے قابل نہیں ہوتے۔ اور انہیں فانی اور فانیہ کا نام اس لیے دیا گیا ہے کہ یہ زندگی کے خاتمے کے قریب ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ روزہ کے بدلے میں ہر روز ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ؕ﴾ (البقرۃ:۱۸۴)

''اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت نہ رکھتے ہوں وہ روزے کے بدلے میں محتاج کو کھانا کھلا دیں۔''

بعض مفسرین کی رائے یہ ہے کہ یہاں يُطِيْقُوْنَ سے مراد لَا يُطِيْقُوْنَ ہے۔ بظاہر اس کے معنی یہ ہیں کہ جو روزہ کی طاقت رکھتے ہوں' جیسا کہ اطاقة کا معنی ہے القدرة علی الشیء کسی چیز پر قدرت رکھنا۔ اس طرح اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس پر فدیہ لازم ہے خواہ وہ روزے رکھے یا نہ رکھے' لیکن اس مفہوم کو قبول نہیں کیا گیا۔ اس کی جگہ پر یہ مطلب لیا گیا ہے کہ جو روزہ رکھنے کی استطاعت نہ رکھتے ہوں وہ ایک مسکین کا فدیہ ادا کریں' کیونکہ يُطِيْقُوْنَ بابِ افعال سے ہے اور باب افعال کا ایک خاصہ سلب ماخذ ہے جس کی بنیاد پر مفسرین کرام نے یہ مفہوم پیش کیا ہے۔ سورۃ النساء کی آخری آیت میں جو الفاظ آئے ہیں: ﴿يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ؕ﴾ (آیت ۱۷۶) وہاں بھی مفسرین کی ایک جماعت نے ''لا'' محذوف مانا ہے۔ یعنی ''اللہ تم سے اس لیے بیان فرماتا ہے کہ بھٹکتے نہ پھرو۔''

گویا اَنْ تَضِلُّوْا یہاں اَنْ لَا تَضِلُّوْا کے مفہوم میں ہے۔ بہرحال یُطِیْقُوْنَہٗ کے مفہوم کے تعین میں مفسرین کرام میں اختلاف بھی پایا جاتا ہے البتہ یہاں وہ بات پیش کی گئی ہے جس کو زیادہ پذیرائی حاصل ہے۔ (واللہ اعلم)

روزہ کے فدیہ کی مقدار صدقۂ فطر کے برابر ہے۔

## (۳) حالتِ حیض اور نفاس

حالتِ حیض اور نفاس میں روزہ قضا کرنا واجب ہے اور ان حالتوں میں عورت کا روزہ رکھنا حرام ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ایک متفق علیہ حدیث ہے' وہ فرماتی ہیں:

''کُنَّا نَحِیْضُ عَلٰی عَھْدِ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ فَنُؤْمَرُ بِقَضَاءِ الصَّوْمِ وَلَا نُؤْمَرُ بِقَضَاءِ الصَّلَاۃِ''

''عہدِ رسالت میں حالتِ حیض میں ہمیں روزہ قضا کرنے کا حکم دیا جاتا' البتہ نماز کی قضا کا حکم نہیں دیا جاتا تھا۔''

حیض اور نفاس دونوں میں ایک ہی حکم ہے۔

## (۴) دورانِ حمل اور رضاعت

ایسی حاملہ عورت پر روزہ مؤخر کرنے میں رخصت ہے جس کے حمل کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو۔ اسی طرح اگر بچے کو دودھ پلاتے ہوئے مشکل ہو رہی ہو کہ اس سے بچے کی صحت پر بُرا اثر پڑ رہا ہے اور اس کو مناسب حد تک دودھ نہیں مل رہا تو اس حالت میں بھی روزے بعد میں رکھے جا سکتے ہیں۔ ایسی عورتوں کے لیے فدیہ نہیں بلکہ قضا ہے۔

## (۵) شدید بھوک اور پیاس میں ہلاک ہونے کے خطرہ کی صورت میں

اس صورت میں بھی فقہاء کرام روزہ کو قضا کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔ وہ اس صورت کو مرض پر محمول کرتے ہیں۔

آپ نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے انتہائی مشکل حالات میں مسلمانوں کو روزہ میں سہولتیں دی ہیں' کیونکہ اسلام اور شریعت کا مقصد تحفظ جان بھی ہے۔ ارشاد ہے:

﴿فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْہِ﴾ (البقرۃ:۱۷۳)

''(بشرطیکہ) اللہ کی نافرمانی نہ کرے اور حد (ضرورت) سے باہر نہ نکل جائے تو اس پر



کچھ گناہ نہیں۔''

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ﴾ (البقرہ:۱۹۵)

''اور اپنے آپ کو خود اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ ڈالو۔''

یہی بات ایک اور مقام پر ان کلمات میں بیان ہوئی:

﴿وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَکُمْ﴾ (النساء:۲۹)

''اور اپنی جانوں کو قتل مت کرو۔''

اللہ تعالیٰ نے کسی جان پر اس کی وسعت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالا ہے۔ ارشاد ہے:

﴿لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا﴾ (البقرۃ:۲۸۶)

''اللہ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔''

## ۶) رمضان کی راتیں

دوران روزہ میاں بیوی کے ازدواجی تعلقات موقوف ہیں' البتہ روزہ کے افطار کرنے کے بعد صبح سحری تک ان پر کوئی قدغن نہیں۔ ارشاد ہے:

﴿اُحِلَّ لَکُمْ لَیْلَۃَ الصِّیَامِ الرَّفَثُ اِلٰی نِسَآئِکُمْ ھُنَّ لِبَاسٌ لَّکُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّھُنَّ عَلِمَ اللّٰہُ اَنَّکُمْ کُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَکُمْ فَتَابَ عَلَیْکُمْ وَعَفَا عَنْکُمْ فَالْئٰنَ بَاشِرُوْھُنَّ وَابْتَغُوْا مَا کَتَبَ اللّٰہُ لَکُمْ﴾ (البقرۃ:۱۸۷)

''روزوں کی راتوں میں تمہارے لیے اپنی عورتوں کے پاس جانا جائز کر دیا گیا ہے۔ وہ تمہاری پوشاک ہیں اور تم ان کی پوشاک ہو۔ اللہ کو معلوم ہے کہ تم (ان کے پاس جانے سے) اپنے حق میں خیانت کرتے تھے سو اس نے تم پر مہربانی کی اور تمہاری حرکات سے درگزر فرمایا۔ تو اب تم (کو اختیار ہے کہ) ان سے مباشرت کرو اور اللہ نے جو چیز تمہارے لیے لکھ رکھی ہے (یعنی اولاد) اس کو طلب کرو۔''

## ۷) روزہ کے دورانیہ میں تخفیف

اُمتِ مسلمہ کے لیے روزے کا دورانیہ دن اور رات نہیں ہے بلکہ صبح صادق سے غروبِ آفتاب تک ہے۔ ارشاد ہے:

﴿وَکُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَکُمُ الْخَیْطُ الْاَبْیَضُ مِنَ الْخَیْطِ الْاَسْوَدِ

مِنَ الْفَجْرِ ص ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ج﴾ (البقرۃ:۱۸۷)

''اور کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ ظاہر ہو جائے سفید دھاری سیاہ دھاری سے صبح کے وقت'
پھر روزے کو پورا کرو رات تک۔''

یہ روزے صرف مضان کے مہینے میں فرض ہیں جنہیں ''اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ'' (گنتی کے چند دن) کہا گیا ہے۔ یہ چند دن کے مہمان ہوتے ہیں۔اس مہمان کا حق یہی ہے کہ اس کا بھرپور احترام کیا جائے اور شوق سے روزے رکھے جائیں۔

یہ سہولتیں اللہ تعالیٰ نے اس لیے پیدا کی ہیں کہ انسان طبعی طور پر ضعیف پیدا ہوا ہے۔ ارشاد ہے:

﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ ج وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ﴿۲۸﴾﴾ (النساء)

''اللہ چاہتا ہے کہ تم پر بوجھ ہلکا کرے اور انسان (طبعاً) کمزور پیدا ہوا ہے۔''

اللہ تعالیٰ کو خوب معلوم ہے کہ انسان اس کے احکام پر کہاں تک عمل پیرا ہو سکتا ہے' لہٰذا بعض احکام میں تخفیف رکھی گئی ہے۔کئی لوگ بیمار ہوتے ہیں' بعض سفر پر ہوتے ہیں اور کئی طرح کی تکلیف میں ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے روزہ رکھنے میں تخفیف پیدا کر دی ہے۔

ان آسانیوں کا تقاضا ہے کہ ہم رمضان المبارک کے روزے رکھیں۔ہم مسلمانوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جو پوری طرح تندرست ہوتے ہیں لیکن روزہ رکھنے میں کوتاہی برتتے ہیں۔ حالانکہ ہمیں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے ہمیں ایسی شریعت عطا کی ہے جو انسان کی بہبود اور فلاح کے لیے ہے' جس میں دشواری کی بجائے آسانی اور سہولت ہے۔ہمیں چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں جی جان سے کوشش کریں' اور جہاں سہولت اور آسانی ہو' اسے اختیار کرنے کو روحِ شریعت کے منافی خیال نہ کریں۔ ❁❁


**جہاد فی سبیل اللہ**

اصل حقیقت' اہمیت ولزوم اور مراحل و مدارج

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کا ایک جامع خطاب

# آخری عشرہ: دوزخ سے نجات

حافظ محمد ادریس ☆

## اللہ کا بندوں پر فخر

صیامِ ماہِ رمضان‘ اعتکاف اور لیلۃ القدر کی تلاش اتنا عظیم عمل ہے کہ آنحضور ﷺ نے اس کی فضیلت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ان مواقع پر اللہ اپنے بندوں پر فخر کرتا ہے۔ امام بیہقی نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے جس کا ترجمہ یوں ہے:

’’رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب لیلۃ القدر ہوتی ہے تو جبریل علیہ السلام ملائکہ کے جھرمٹ میں اُترتے ہیں اور ہر اُس بندے کے لیے دعا کرتے ہیں جو اُس وقت کھڑا ہوا یا بیٹھا ہوا اللہ عزوجل کا ذکر کر رہا ہو (جاگ رہا ہو اور عبادت کر رہا ہو)۔ پھر عیدالفطر کا دن ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر اپنے ملائکہ کے سامنے فخر کرتا ہے اور انھیں مخاطب کر کے فرماتا ہے کہ اے میرے فرشتو! اس اجیر (مزدور) کی جزا کیا ہے جس نے اپنے ذمّے کا کام پورا کر دیا؟ فرشتے عرض کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! اس کی جزا یہ ہے کہ اس کی مزدوری اسے پوری پوری دے دی جائے۔ اللہ تعالیٰ جواب دیتا ہے کہ اے میرے ملائکہ! میرے ان بندوں نے اپنا وہ فرض ادا کر دیا جو میں نے ان پر عائد کیا تھا۔ پھر اب یہ گھروں سے (عید کی نماز ادا کرنے اور) مجھ سے گڑگڑا کر مانگنے کے لیے نکلے ہیں‘ اور میری عزت اور میرے جلال کی‘ اور میرے کرم اور میری علوشان کی‘ اور میری بلند مقامی کی قسم ہے کہ میں ان کی دعائیں ضرور قبول کروں گا۔ پھر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو مخاطب کر کے فرماتا ہے: جاؤ میں نے تمھیں معاف کر دیا اور تمھاری برائیوں کو بھلائیوں سے بدل دیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ پھر وہ اس حالت میں پلٹتے ہیں کہ انہیں معاف کر دیا جاتا ہے۔‘‘ (سنن بیہقی)

☆ ڈائریکٹر ادارہ معارف اسلامی‘ منصورہ‘ لاہور maarif_e_islami@yahoo.com



سید مودودیؒ اس حدیث کی تشریح میں فرماتے ہیں:

’’اللہ تعالیٰ سال کے سال اپنے مؤمن بندوں کے ساتھ یہ معاملہ کرتا ہے‘ کیونکہ انہوں نے رمضان کے روزے رکھے اور لیلۃ القدر کی تلاش میں راتوں کو عبادت کرتے رہے۔ پھر عید کے روز نماز کے لیے نکلے اور انھوں نے اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگیں۔ اس کے نتیجے میں وہ اس کے ہاں سے مغفرت اور مہربانیاں حاصل کر کے پلٹتے ہیں۔‘‘
(کتاب الصوم‘ ص ۲۶۶)

نبی اکرم ﷺ عام دنوں میں بھی عبادت کا بڑا اہتمام فرمایا کرتے تھے‘ مگر رمضان میں تو شان ہی نرالی ہوتی تھی۔ شعبان ہی میں کمرِ ہمت باندھ لیتے اور رمضان کی آمد کے ساتھ نیکیوں میں یوں مشغول ہو جاتے جیسے تند و تیز ہوا چلنے لگتی ہے۔ پھر رمضان کا آخری عشرہ تو بالخصوص آپ ﷺ کے انہماک و وارفتگی کی ایسی تصویر پیش کرتا کہ سبحان اللہ! حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی زبانی امام مسلم نقل فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ رمضان کے آخری عشرے میں عبادتِ الٰہی میں جس قدر محنت و مشقت فرمایا کرتے تھے‘ اس کی مثال کسی اور زمانے اور ایام میں نہیں ملتی۔

## رمضان کا آخری عشرہ

رمضان المبارک کے آخری عشرے میں اعتکاف رسول اللہ ﷺ کی سنتِ مؤکدہ ہے۔ آپ ﷺ نے سوائے ایک سال کے ہمیشہ رمضان المبارک کا آخری عشرہ اعتکاف میں گزارا۔ ایک سال آپ ﷺ جہاد پر نکل جانے کی وجہ سے اعتکاف نہ کر سکے اور اگلے سال آپ ﷺ نے دس کے بجائے بیس روز کا اعتکاف فرمایا۔ اتفاق سے یہی محمد رسول اللہ ﷺ کا آخری اعتکاف تھا۔

رمضان المبارک کا مہینہ ہر سال ہمارے اوپر سایہ فگن ہوتا ہے۔ اس میں اُمتِ مُسلمہ کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی بے پایاں رحمت سے لیلۃ القدر کی نعمتِ عظمیٰ مقدر کر رکھی ہے۔ اس کی تلاش پورے رمضان المبارک میں ہونی چاہیے‘ مگر آخری عشرہ خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔ جو مسلمان بھی اعتکاف کر سکتا ہو اُسے اپنا دامن بھرنے کے لیے ضرور اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔

## اعتکاف کی مدّت

آپ دس روز اعتکاف نہ بھی کر سکیں تو مسجد میں کچھ دیر کے لیے بھی اعتکاف کی نیت سے

بیٹھ سکتے ہیں۔ بہرحال مطلوب تو یہی ہے کہ آپ اعتکاف میں دس روز لگائیں۔ یہی مسنون اعتکاف ہے۔ یہ اعتکاف اجتماعی ہو تو اس کے نتائج وثمرات کئی گنا بڑھ جاتے ہیں۔ یہ بات قابلِ ترجیح ہے کہ اپنے محلّے یا بستی کی مسجد میں آپ اعتکاف کریں۔ اعتکاف کے لیے اپنے ساتھی پہلے سے تلاش کر لیجیے۔ جو ساتھی آپ کی نظر میں ہیں اور جن کو آپ دین حق کا کارکن اور ہم سفر بنانا چاہتے ہیں ان سے رابطہ کر لیجیے۔ اعتکاف کے دس دنوں میں آپ اپنے اندر جتنا ذہنی انقلاب برپا کر سکتے ہیں شاید پورے سال میں اتنا ممکن نہ ہو۔

اعتکاف کے دوران دُنیوی باتوں اور دلچسپیوں سے مکمل اجتناب کیجیے۔ اعتکاف سنّت کے عین مطابق ہونا چاہیے۔ معتکِف انتہائی اشد ضرورت کے تحت اپنے معتکَف (اعتکاف کے لیے مختص گوشہ) سے باہر نکل سکتا ہے' مثلاً قضائے حاجت اور وضو وغیرہ کے لیے یا غسل واجب ہو جائے تو غسل کے لیے۔ اگر کوئی شخص کھانا پہنچانے والا نہ ہو تو کھانا لانے کے لیے جا سکتا ہے' مگر کسی سے کوئی غیر ضروری بات وغیرہ نہیں کر سکتا۔ یہ سارا عرصہ ذکر وفکر' نفل وعبادت' مطالعہ و تلاوت' تعلیم وتعلّم اور خیر و بھلائی کے لیے وقف کر دینا چاہیے۔ سہولت کے مطابق پورے چوبیس گھنٹے کا ٹائم ٹیبل پہلے سے ہی بنا لیجیے۔ دورانِ اعتکاف اس میں ردّوبدل کرنا پڑے تو بھی مضائقہ نہیں۔ اعتکاف کو محض استراحت اور نیند کا ذریعہ نہ بنائیے۔ اس کے دوران خیر و برکت سے اپنا دامن بھرنے کی فکر کیجیے۔ لیلۃ القدر کی تلاش میں راتوں کا بیشتر حصہ عبادت اور تلاوت میں گزاریے۔ دل میں یقین رکھیے کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے آپ کو لیلۃ القدر کی نعمت عطا فرمائے گا۔ لیلۃ القدر نصیب ہو جائے تو سنت کے مطابق خوب دعائیں کیجیے۔ خصوصاً اللہ تعالیٰ سے عفو و درگزر اور دوزخ سے نجات کی التجا کیجیے۔

## خواتین کا اعتکاف

خواتین بھی اعتکاف کر سکتی ہیں' مگر ان کا اعتکاف گھروں میں ہوتا ہے۔ اپنے حالات کے مطابق اپنے گھروں میں دورانِ اعتکاف جن باتوں کے اہتمام کا تذکرہ بالائی سطور میں ہوا ہے' خواتین کو بھی انہی پر عمل کرنا چاہیے۔ اگر خواتین کا کوئی ادارہ یا مرکز ہو اور وہ وہاں مقیم ہوں تو وہ بھی اجتماعی اعتکاف کر سکتی ہیں اور اس میں کوئی مضائقہ نہیں' تاہم خاتون کا بہترین اعتکاف اس کے اپنے گھر ہی میں ہوتا ہے۔ اس حوالے سے سید مودودیؒ فرماتے ہیں:

(باقی صفحہ 76 پر)

# اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ

## سرورِ کونین ﷺ پر وحیٔ الٰہی کا نقطۂ آغاز

عتیق الرحمٰن صدیقی ☆

﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ① خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ② اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ③ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ④ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ⑤﴾ (العلق)

''پڑھو (اے نبی ﷺ) اپنے ربّ کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا۔ جمے ہوئے خون کے لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔ پڑھو اور تمہارا ربّ بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا۔ انسان کو وہ علم دیا جسے وہ جانتا نہ تھا۔''

### وحی کا آغاز

یہ سورۃ العلق کی پہلی پانچ آیات ہیں۔ اس سورہ کا دوسرا نام ''اقرأ'' بھی ہے۔ ان پانچ آیات کے بارے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی کثیر تعداد اور علمائے اُمت کی عظیم اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ قرآن کریم کا آغاز اس سورہ کی پہلی پانچ آیات سے ہوا اور یہ سب سے پہلی وحی ہے جو رسول کریم ﷺ پر نازل ہوئی۔ بعض روایات میں سورۃ المدثر کی ابتدائی آیات کو وحی کا نقطۂ آغاز قرار دیا گیا ہے۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے بطور خاص آنحضرت ﷺ سے سوال کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ سورۃ المدثر کی ابتدائی آیات سب سے پہلے نازل ہوئیں۔ مگر علمائے تفسیر میں سے اکثریت کی رائے یہ ہے کہ سورۃ العلق کی ابتدائی پانچ آیات ہی وحی کا نقطۂ آغاز ہیں۔ اس معاملے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی وہ حدیث جسے امام احمدؒ بخاریؒ، مسلم اور دوسرے محدّثین نے متعدّد سندوں سے نقل کیا ہے، صحیح ترین احادیث میں شمار ہوتی ہے۔ اس روایت سے اس موقف کی تائید ہوتی ہے۔

☆ پرنسپل ریٹائرڈ، ہری پور



### وحی کے نقطۂ آغاز سے متعلق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت

ہم یہاں بخاری، باب بدء الوحی سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کا ترجمہ نقل کرتے ہیں:

''ہم سے یحییٰ بن بکیر نے حدیث بیان کی، وہ کہتے ہیں کہ ہمیں حضرت لیث نے بتایا، انہوں نے حضرت عقیل سے، حضرت عقیل نے ابن شہاب زہری سے اور انہوں نے عروہ بن زبیر کے حوالہ سے اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ابتدا میں رسول اکرم ﷺ پر وحی کا سلسلہ اچھے خوابوں سے شروع ہوا۔ آپؐ جو کچھ خواب میں دیکھتے تھے وہ سپیدۂ سحر کی طرح نمودار ہو جاتا تھا، پھر آپؐ کو خلوت گزینی محبوب ہوگئی، غارِ حرا میں خلوت اختیار فرماتے تھے، کئی کئی رات دن وہ مسلسل وہاں رہ کر عبادت گزاری کرتے تھے۔ جب تک کہ گھر آنے کی رغبت نہ ہوتی۔ وہاں کے لیے آپؐ توشہ بھی ساتھ لے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ آپؐ کے پاس غارِ حرا میں حق (وحی) کا ظہور ہوا اور فرشتہ نے آکر کہا: پڑھیے! حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ میں نے جواب دیا: میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ اس پر فرشتے نے مجھے پکڑ کر اتنے زور سے بھینچا کہ میری طاقت جواب دے گئی، پھر مجھے چھوڑ کر کہا: پڑھیے، میں نے کہا: میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ فرشتے نے دوبارہ دبوچ کر حسبِ سابق خوب بھینچا اور پھر مجھے چھوڑ کر کہا: پڑھیے، میں نے کہا: میں تو پڑھنے والا ہوں نہیں (کس طرح پڑھوں؟) فرشتے نے تیسری بار مجھے بھینچا اور کہا: ''پڑھیے اپنے رب کے نام سے جس نے ہر چیز کو پیدا کیا۔ انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا۔ پڑھیے! آپ کا ربّ (پروردگار) بڑے کرم والا ہے۔''

رسول اکرم ﷺ آیاتِ مذکور سے اپنے سینے کو معمور اور منوّر پا کر واپس گھر تشریف لائے۔ آپؐ کا قلبِ اطہر (پہلی وحی کے رعب اور جلال کی وجہ سے) کانپ رہا تھا۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ مجھے کمبل اوڑھا دو، مجھے کمبل اوڑھا دو۔ انہوں نے کمبل اڑھایا۔ جب سکون کی کیفیت ہوئی تو آپؐ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو سارا حال سنایا، پھر یہ بھی فرمایا کہ مجھے اپنی جان کا خوف لاحق ہوگیا ہے۔ انہوںؓ نے جواب میں فرمایا:

''ہرگز ایسا نہیں ہوگا، اللہ کی قسم! اللہ آپؐ کو کبھی رسوا نہ کرے گا۔ آپؐ تو صلہ رحمی کرتے ہیں، ناتواں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، اپنی کمائی میں مفلسوں اور ناداروں کو شریک کرتے ہیں، مہمان نوازی فرماتے ہیں اور راہِ حق میں مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔''

## ورقہ بن نوفل

پھر حضرت خدیجہ ؓ آپ ﷺ کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں جو ان کے چچازاد بھائی تھے۔ وہ زمانۂ جاہلیت میں نصرانی ہو چکے تھے۔ وہ عبرانی زبان کے کاتب تھے اور انجیل کو بھی اللہ کی منشا کے مطابق عبرانی زبان میں لکھا کرتے تھے۔ وہ بہت عمر رسیدہ تھے اور ان کی بینائی بھی جاتی رہی تھی۔ حضرت خدیجہ ؓ نے ان سے کہا کہ بھائی اپنے بھتیجے کا حال تو سنیے! ورقہ بن نوفل نے پوچھا: بھتیجے تم کیا دیکھتے ہو؟ آپؐ نے جو دیکھا بیان فرما دیا۔ ورقہ آپؐ کے حالات سن کر بے ساختہ بول اٹھے: ''یہ تو وہی ناموس ہے جسے حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰ ؑ کے پاس بھی بھیجا تھا۔ کاش میں تمہارے عہد نبوت میں جوان ہوتا' کاش میں اس وقت تک زندہ رہتا جب آپؐ کی قوم آپ کو نکال دے گی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا وہ لوگ مجھے نکال دیں گے؟ ورقہ نے کہا: ہاں! جو شخص بھی اس طرح کی چیز لے کر آیا جیسی آپؐ لائے ہیں' لوگوں نے اس سے دشمنی کی ہے۔ اگر مجھے آپؐ کی نبوت کا زمانہ مل گیا تو میں آپؐ کی پوری قوت سے مدد کروں گا۔ پھر کچھ ہی عرصے بعد ورقہ کا انتقال ہو گیا اور وحی کا سلسلہ بھی کچھ مدت کے لیے بند ہو گیا۔'' (بحوالہ معین الباری' شرح صحیح البخاری' ح ۳)

## اِقرأ کا مفہوم

یہ تو سورۃ العلق کی مذکورہ پہلی پانچ آیات کا پس منظر تھا۔ اب ہم اختصار سے ان کی وضاحت کرتے ہیں: اِقْرَاْ کے معنی ہیں: پڑھو یا پڑھیے۔ (قَرَأَ یَقْرَءُ سے فعل امر ہے۔) اس میں نبی کریم ﷺ کو پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے' مگر اس کا مطلب اقرأ علی الناس یا اتل علی الناس بھی ہے' یعنی دوسروں کو بطریق دعوت سناؤ بھی' جیسا کہ سورۃ الاعراف میں ہے: ﴿وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ﴾ (الاعراف) ''جب قرآن سنایا جائے تو اس کو توجہ سے سنو اور خاموش رہو تا کہ تم پر رحم کیا جائے''۔ فرشتے نے نبی کریم ﷺ سے پڑھنے کا مطالبہ کیا تو آپ ﷺ کا جواب میں یہ فرمانا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں' اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ فرشتے نے وحی کے الفاظ لکھی ہوئی صورت میں آپؐ کے سامنے پیش کیے تھے۔ ویسے اگر فرشتے کی آواز میں آواز ملا کر پڑھنا مقصود ہوتا تو نبی کریم ﷺ ہرگز یہ نہ فرماتے کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔



## بِاسْمِ رَبِّكَ کی وضاحت

بِاسْمِ رَبِّكَ میں لفظ اسم سے یہ واضح ہوتا ہے کہ قرآن جب بھی پڑھا جائے تو اللہ کا نام لے کر یعنی بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ پڑھ کر شروع کیا جائے۔ صاحبِ معارف القرآن نے تفسیرِ مظہری کے حوالہ سے یہ بھی لکھا ہے:

> ''بِاسْمِ رَبِّكَ کے لفظ سے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اگرچہ آپ اپنی موجودہ حالت کے اعتبار سے اُمی ہیں' لکھے پڑھے نہیں' مگر آپؐ کے رب کو سب قدرت ہے کہ وہ اُمی شخص کو اعلیٰ علوم اور خطابت کا سلیقہ اور فصاحت و بلاغت کا وہ درجہ دے سکتا ہے کہ جس کے سامنے بڑے بڑے لکھے پڑھے عاجز ہو جائیں' جیسا کہ بعد میں اس کا ظہور ہوا۔'' (معارف القرآن' جلد ہشتم)

پھر اسماءِ حسنیٰ میں سے ربّ کے لفظ کے استعمال کیے جانے سے مزید اس امر کی تصدیق ہوتی کہ وہ ربّ کریم مربی ہے' ہر طرح کی تربیت کرتا ہے' وہ اُمی ہونے کے باوجود آپ سے پڑھوا سکتا ہے۔ اس میں ایک انتباہ بھی ہے کہ یہ خداوند تعالیٰ کا فرمان ہے' ربّ دو جہاں کا کلام ہے' یہ داعی کا کلام نہیں بلکہ یہ دو جہاں کے خالق و مالک نے اتارا ہے۔ اب نبی مکرم ﷺ کا منصب یہ ہے کہ وہ اسے لوگوں تک پہنچائیں اور لوگوں کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ کلام اللہ کی بے چون و چرا تعمیل کریں۔

## پڑھنا لکھنا مسلمان کی زندگی کا لازمی جزو ہے

اس آیۂ کریمہ میں ایک واضح اشارہ اس امر کا بھی موجود ہے کہ پڑھنا لکھنا مسلمان کی زندگی کا ایک لازمی اور ناگزیر جزو ہے۔ عَلَّمَ الْاَسْمَآءَ سے حضرت آدم ؑ کی بعثت کا آغاز ہوا اور اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ سے حضور نبی کریم ﷺ پر اس کا اختتام ہوا۔ اللہ علیم و خبیر ہے' علم کا منبع و مرجع ہے۔ جو علم اور نظامِ تعلیم تصورِ توحید سے تہی ہو گا وہ بنی نوعِ انسان کی تباہی و بربادی کا موجب تو ہو سکتا ہے مگر اس کی فلاح و کامرانی کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔ انبیاء کرام ؑ ایجاد و اکتشاف کے کبھی مدعی نہیں ہوئے اور نہ انہوں نے کبھی دعویٰ کیا کہ وہ فلاں علوم میں مہارت رکھتے ہیں۔ وہ اپنے متعلق نہ تو مبالغہ آرائی سے کام لیتے رہے اور نہ کبھی ایسی عاجزی اور خاکساری کا اظہار کیا جس میں تصنع ہو۔ انہوں نے لوگوں کو صحیح علم سے آگاہ کیا' اس علم پر عملاً یقین کی کیفیت پیدا کی اور اس یقین کے مطابق زندگی گزارنے کا ڈھنگ سکھایا۔ چنانچہ یہاں

بھی آغاز علم سے کیا' پڑھنے پڑھانے کی ترغیب دی اور پروردگار کی ذات وصفات کے علم سے روشناس کیا اور بتایا کہ اس کائنات میں صرف اس کی مرضی اور حکمت چل رہی ہے اور وہ بغیر کسی کی شرکت کے یہ نظام چلا رہا ہے۔

## انسان کی تخلیق

اللہ تعالیٰ نے پہلی آیۂ کریمہ میں تمام کائنات کے پیدا کیے جانے کا ذکر فرمایا' مطلقاً پیدا کرنے کی بات کی' جبکہ دوسری آیت میں خاص طور پر انسان کا ذکر کیا کہ اللہ نے ایک حقیر حالت سے اس کی تخلیق کا آغاز فرمایا اور پھر خاص اہتمام سے اسے پورا انسان بنایا۔ یہاں پر عَلَق کا لفظ استعمال کیا جس کے معنی جمے ہوئے خون کے ہیں اور یہ جمع ہے عَلَقَة کی۔ خون کی پھٹکی اور تھکے کو بھی علق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ انسان کی خلقت کے ابتدائی مراحل کی یاد دہانی قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر کی گئی ہے۔ سورۃ الحج میں فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ۭ وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَاۗءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ۚ﴾ (آیت ۵)

''اے لوگو! اگر تم کو دھوکا ہے جی اٹھنے میں تو ہم نے تم کو بنایا مٹی سے' پھر قطرہ سے' پھر جمے ہوئے خون سے' پھر گوشت کی بوٹی نقشہ بنی ہوئی سے اور بدون نقشہ بنی ہوئی سے' اس واسطے کہ تم کو کھول کر سنا دیں۔ اور ٹھہرا رکھتے ہیں ہم پیٹ میں جو کچھ چاہیں ایک وقت معین تک' پھر تم کو نکالتے ہیں بچہ' پھر جب تک کہ پہنچو اپنی جوانی کے زور کو۔''

اللہ تعالیٰ نے یہاں اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ جو ذات گرامی خون کی ایک حقیر پھٹکی سے عاقل اور مدرک انسان بنا دیتی ہے اس کے لیے کوئی مشکل نہیں کہ اس کو دوبارہ پیدا کرے۔

انسان کی تخلیق میں پوشیدہ حکمتوں کی طرف بھی توجہ منعطف کی گئی ہے کہ اس کی پیدائش عبث نہیں بلکہ اسے ایک عظیم نصب العین کے حصول کی خاطر پیدا کیا گیا ہے' اس لیے ایک روز اعمال کی جزا و سزا یقیناً ہوگی۔ اس امر کی طرف بھی اشارہ ہے کہ ایک حقیر عنصر سے انسان کی پیدائش ہوئی' اس لیے تمرد و سرکشی اسے زیب نہیں دیتی اور نہ غرور اور تکبّر اس کے شایانِ شان ہے۔



## اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ

تیسری آیت میں پھر اسی حکم کی تاکید کی گئی ہے جو اوپر دیا گیا ہے کہ اپنے ربّ کا نام لے کر پڑھیں۔ جب آپ اپنے ربّ کا نام لے کر پڑھیں گے تو پھر علوم و معارف سے سرشار کر دینا اس کے ذمہ ہے۔ اس کی شانِ کریمی ضرور جلوہ نما ہوگی۔ یہاں کَرِیم کے بجائے اَکْرَم کا لفظ استعمال کیا گیا جو افعل التفضیل کا صیغہ ہے۔ تفسیر مظہری میں لکھا گیا ہے کہ اکْرَم میں کَرِیم سے بھی زیادہ مبالغہ ہے اور اکرم سے مراد وہ ہستی ہے جو بلاغرض انعام کرے اور اتنا عطا کر دے کہ کیف و کم کا شمار نہ ہونے پائے۔ اللہ تعالیٰ معلّمِ حقیقی ہے' اس کے علوِشان کا اقتضاء یہ ہے کہ وہ اکرم ہو۔ اس منصبِ جلیلہ پر جو بھی متمکّن ہو اس کا بڑا بزرگ ہونا اور بخشش و عطا سے متّصف ہونا لازمی ہے۔ اس میں اندازِ کریمانہ اپنی انتہاؤں پر ہوں جو اس کے جذب و کشش اور فیضان پر منتج ہوتے ہوں' اس کی نگاہ دل ربا اور دلکشا ہو تاکہ موعظت حسنہ کا اثر جمیل تلامذہ کو ارفع و اعلیٰ صفات سے متّصف کرنے میں پوری طرح ممد و معاون ہو اور کردار کا حسن نہایت خوشگوار اثرات مرتّب کر سکے۔ تھڑدلی' تنگ نظری اور بخیلی اس منصب کی توقیر اور عظمت سے لگا نہیں کھاتے۔

## اللہ کے جود و کرم کا تسلسل

اللہ تعالیٰ کے جود و کرم اور بخشش و عطا کا تسلسل ہر لحظہ اور ہر ساعت رواں دواں رہتا ہے۔ ایک طرف تو اس نے ایک حقیر ترین حالت سے انسان کی ابتدا کی تو دوسری طرف ایک شرف عظیمہ سے اسے مشرف کیا' اسے متنوع علوم کی وسعتوں سے ہمکنار کیا' علم کی گراں قدر روشنی سے اس کی تزئین و آرائش کی' قلم کے استعمال سے لکھنے کا فن سکھا کر اس کی قدر و منزلت میں مزید اضافہ کیا۔ افکار و نظریات اور علوم و فنون کی اشاعت و ترویج میں قوتِ بیانیہ کی افادیت و اہمیت سے انکار ممکن نہیں' مگر زمان و مکان کی حد بندیوں سے ماورا اگر کسی چیز کو منزلت عطا کی گئی ہے تو وہ قلم ہے۔ قرآن حکیم کی نشر و اشاعت اور نشو و ارتقاء قلم کی جولانیوں ہی کا صدقہ ہے۔ قرآن حکیم نے قلم کی جلالت شان کے تناظر میں اس کی اور اس کے جواہر پاروں کی قسم کھائی ہے۔ نوکِ قلم کی جنبشوں سے صفحہ قرطاس لعل و گہر سے مرصع ہوتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ اس عظیم فن سے انسان کو آگاہ نہ کرتا تو اس کی علمی قابلیت نہ صرف سکڑتی اور ٹھٹھرتی بلکہ منجمد ہو کر رہ جاتی۔ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ الْقَلَمَ، فَقَالَ لَهُ اكْتُبْ فَكَتَبَ مَا يَكُوْنُ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ، فَهُوَ عِنْدَهُ فِي الذِّكْرِ فَوْقَ عَرْشِهٖ))

''سب سے پہلے اللہ نے قلم کو پیدا کیا اور اس کو حکم دیا کہ لکھے۔ اس نے تمام چیزیں جو قیامت تک ہونے والی تھیں، لکھ دیں، اور یہ کتاب اللہ تعالیٰ کے پاس عرش پر ہے۔'' (قرطبی بحوالہ معارف القرآن جلد ہشتم)

اللہ تعالیٰ نے جو کتابیں اپنے برگزیدہ بندوں پر اتاریں، علوم وحکم کی جو تدوین ہوئی، یہ سب کچھ قلم کا رہین منت ہے۔ گویا یہ علم کی بقا اور حفاظت کا ایسا ذریعہ ہے کہ اگر یہ نہ ہو تو سارے کام اختلال کا شکار ہو کر رہ جائیں۔

## ذرائع علم محدود نہیں

یہ بات ذہن سے محو نہ ہونے پائے کہ وہ ذاتِ پاک قلم کے ذریعے یقیناً اپنے بندوں کو علوم ومعارف کی دولت سے مالا مال کرتی ہے، مگر وہ اس پر قادر ہے کہ جہاں چاہے جسے چاہے انوار وتجلّیات سے منوّر کر دے۔ وحی والہام کے ذریعے اس نے بہت سی چیزوں کا علم انسان کو عطا کیا اور اس کی فطرت میں بہت سی چیزیں ودیعت فرما دیں۔ اصل میں انسان کو جو کچھ ملتا ہے وہ اس قادر وقدیر کی عطا سے ملتا ہے۔ وہ بغیر کسی واسطہ کے بھی جب چاہے تو کسی کے دل کو بقعہ نور بنا سکتا ہے۔ اللہ نے انسان کو فہم وادراک اور عقل وشعور سے آراستہ کیا۔ قرآن نے کہا: ﴿وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا﴾ (النحل:۷۸) یعنی اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے بطن سے ایسی حالت میں نکالا کہ تم کچھ نہ جانتے تھے۔ معلوم ہوا کہ اصل تعلیم دینے والا وہ خود ہے جو ظاہری ذرائع کا مقید نہیں۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادی فرماتے ہیں:

''نوعِ بشر کو ماضی وحال میں جو کچھ معلوم ہوا ہے اور آئندہ جو کچھ بھی معلوم ہو سکے گا یہ سب فیضانِ الٰہی کا پرتو نہیں تو اور کیا ہے؟ انسان کو جن جن علوم وفنون، معارف وصنائع پر ناز ہے یہ سب اگر حق تعالیٰ ہی کے سکھائے ہوئے، بتائے ہوئے، سمجھائے ہوئے نہیں تو اور کیا ہیں؟ قرآن مجید نے یہاں ایسی ہی گہری حقیقت کو یاد دلایا ہے۔'' (تفسیرِ ماجدی)

(باقی صفحہ 76 پر)

# ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کا تفسیری منہج

ڈاکٹر سید سلمان ندوی ☆

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام ۱۹۔۲۰ مارچ ۲۰۱۱ء کو قرآن آڈیٹوریم لاہور میں ''ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کی قرآنی، دینی اور ملّی خدمات'' کے عنوان سے دو روزہ محاضراتِ قرآنی کا اہتمام کیا گیا۔ اس محاضراتِ قرآنی میں سید سلیمان ندویؒ کے خلف الرشید ڈاکٹر سید سلمان ندوی (ڈربن، جنوبی افریقہ) نے ''ڈاکٹر اسرار احمد کا تفسیری منہج'' کے موضوع پر خطاب فرمایا۔ قرآن اکیڈمی لاہور کے شعبہ مطبوعات کے ادارتی معاون حافظ محمد زاہد کی ترتیب وتسوید کے بعد یہ خطاب قارئین میثاق کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

جناب صدرِ مجلس اور معزز سامعینِ کرام!

سب سے پہلے میں اپنے برادر محترم ڈاکٹر ابصار احمد صاحب اور برادر عزیز حافظ عاکف سعید صاحب کا انتہائی ممنون اور مشکور ہوں کہ نہ صرف انہوں نے مجھے اس ذی وقار سیمینار میں آنے کی دعوت دی اور مجھے یہ موقع فراہم کیا کہ میں ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی ملّی، دینی اور قرآنی خدمات پر انہیں خراجِ تحسین پیش کرسکوں، بلکہ اس سیمینار میں آنے پر انہوں نے بہت اصرار بھی فرمایا۔ درحقیقت ڈاکٹر صاحب مرحوم کے بارے میں یہ ایک ایسا حق اور ایسا فرضِ کفایہ تھا جس کو ادا کرنا ضروری تھا اور کارکنانِ انجمن خدام القرآن نے اس مجلس کا اہتمام کر کے موقع بہم پہنچایا کہ ڈاکٹر صاحب کی خدمات اور خاص طور پر ان کے تفسیری منہج پر گفتگو کی جائے۔ اس لحاظ سے بھی کارکنان باعثِ تبریک ہیں کہ ﴿هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ۝۶۰﴾ (الرحمٰن) ''احسان کا بدلہ احسان کے سوا کچھ نہیں۔''

☆ ڈربن، جنوبی افریقہ



## موتُ العالِم موتُ العالَم

عجیب بات ہے کہ ایک سال کے دوران تین ایسی علمی شخصیات کا حادثہ پیش آیا جس نے علمی دنیا کو واقعتاً ''محروم'' کر دیا۔ گزشتہ سال ۱۴/اپریل کو ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے ارتحال کا حادثہ پیش آیا جو میرے لیے بہت اچانک تھا۔ ڈاکٹر صاحب ۲۰۰۹ء میں جنوبی افریقہ گئے تھے، وہاں شکاگو میں ان سے ملاقات بھی ہوئی تھی۔ وہ عارضہ قلب کی وجہ سے وہاں کے ہسپتال میں زیرعلاج تھے۔ وہاں کے احباب کی دعوت پر ڈاکٹر صاحب وہاں تشریف لے گئے تھے۔ میں نے وہاں کے لوگوں سے کہا کہ آپ نے ڈاکٹر صاحب پر ظلم کیا کہ عارضہ قلب کے باوجود آپ نے انہیں بلالیا۔ لیکن یہ قضا وقدر کے فیصلے ہوتے ہیں۔ آپ وہاں تشریف لائے اور ماشاء اللہ اپنے قرآنی نکات سے لوگوں کی علمی پیاس کو خوب بجھایا۔ دوسرا حادثہ میرے عزیز دوست ڈاکٹر محمود احمد غازی کے انتقال کا تھا اور وہ انتہائی سخت حادثہ تھا۔ تیسرا حادثہ جو اسی سال پیش آیا وہ جامعہ اشرفیہ میں ہمارے دوست مولانا عبدالرحمٰن اشرفی صاحب کا تھا۔ اللہ تعالیٰ ان پر رحم کرے اور اپنی جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ مولانا صاحب علماء اور غیر علماء میں بہت مقبول تھے۔ ان کے جنازے میں جس قدر اژدحام تھا وہ ان کی مقبولیت کی نشانی ہے۔ جانے والا چلا جاتا ہے اور پیچھے رہنے والوں کے لیے اپنے نقش قدم چھوڑ جاتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کے نقشِ قدم پر چلا جائے۔

## ڈاکٹر صاحب سے تعلق کی ابتدا

ڈاکٹر صاحب سے میری پہلی ملاقات بہت بعد میں ہوئی، حالانکہ ڈاکٹر صاحب کے نام اور کام سے تو میں بہت عرصے سے واقف تھا، اس لحاظ سے کہ جب وہ اپنے طالب علمی کے زمانے میں لاہور میں تھے اور جمعیت طلبہ سے وابستہ تھے تو اس وقت میں ان سے واقف تھا، لیکن عجیب بات ہے کہ ملاقات کبھی نہیں ہوئی۔ غالباً ۱۹۸۰ء کا زمانہ تھا، میں کراچی میں کسی لیکچر کے سلسلے میں آیا ہوا تھا۔ ایک دن میرے پاس ان کے ایک عزیز جو کراچی میں مقیم تھے، کا فون آیا کہ آج رات ۱۲ بجے ڈاکٹر صاحب کراچی آرہے ہیں اور ان کی خواہش آپ سے ملنے کی ہے۔ یہ میری بڑی خوش قسمتی تھی اور میرے لیے بڑے اعزاز کی بات تھی کہ ڈاکٹر صاحب مجھ سے ملنے کے لیے آرہے ہیں۔ میں نے کہا وہ ضرور تشریف لائیں، لیکن میرے لیے پریشانی یہ ہے کہ کل صبح سویرے میں نے جنوبی افریقہ واپس جانا ہے۔ اس لیے اگر ملاقات ممکن ہے تو یہی

ایک صورت ہے کہ آج رات ۱۲ بجے جب وہ کراچی ایئرپورٹ پر اُتریں تو سیدھے میرے گھر آجائیں۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب ایئرپورٹ سے سیدھا میرے گھر تشریف لائے اور اپنے ساتھ تنظیمِ اسلامی کے بہت سارے فرمودات اور رسائل بھی لے کر آئے۔ مجھ سے فرمایا کہ ان کو دیکھو اور دیکھنے کے بعد اپنا تاثر بھی مجھے بتاؤ۔ میں یہ لٹریچر اپنے ساتھ جنوبی افریقہ لے گیا اور وہاں اس کا فرصت سے مطالعہ کیا اور پھر جواب میں ڈاکٹر صاحب کو ایک خط بھی لکھا۔

پہلی ہی ملاقات میں ان سے اتنی بے تکلفی ہوگئی تھی کہ میں جو بات ان سے کہنا چاہتا تھا' کہہ نہ سکا۔ میں نے خط کے ذریعے اس کا ذکر کیا کہ آپ نے تنظیمِ اسلامی ہی بنانی تھی تو جماعت اسلامی کیوں چھوڑی؟ اس کا جواب انہوں نے یہ دیا کہ یہ بات بعد میں آپ کو سمجھ میں آجائے گی۔ اس کے بعد الحمدللہ تعلقات میں اس قدر استواری پیدا ہوگئی کہ جب ان کے گھٹنوں میں تکلیف شروع ہوئی تو اس وقت میں شکاگو میں تھا اور وہ بھی یہاں آئے ہوئے تھے۔ میں نے مزاحاً کہا کہ گھٹنوں کی تکلیف ایسی پریشانی کی چیز نہیں ہے ؎

ہوئے ہیں پاؤں پہلے ہی نبردِ عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے!

## قرآن: ڈاکٹر صاحب کا اصل موضوع

ڈاکٹر صاحب کا اصل موضوع اور محور قرآن پاک تھا۔ یہی وجہ ہے کہ کوالیفائیڈ میڈیکل ڈاکٹر ہونے کے باوجود وہ اپنی میڈیکل پریکٹس کو مکمل طور پر چھوڑ کر ہمہ وقت قرآن کی خدمت میں لگ گئے۔ مولانا زکریا صاحبؒ نے اپنی کتاب ''آپ بیتی'' میں ایک جملہ لکھا ہے کہ جب کسی شخص کی نظر کسی بزرگ پر پڑتی ہے تو اس شخص کی نظر میں یہ اس بزرگ کی زندگی کا آخری حصہ ہوتا ہے درآنحالیکہ اس کی نظر میں اس بزرگ کی زندگی کا آغاز ہونا چاہیے اور پھر اس آغاز سے اس منزل تک کیسے پہنچا ہے' اس پر غور کیا جائے۔ یہ سفر ہر ایسے شخص کو پیش آتا ہے جس کو علمی انہماک حاصل ہو اور اس میں کسی قسم کی جِدّوجُہد کا سلسلہ پیدا ہو۔ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ بھی یہی واقعہ پیش آیا اور انہوں نے اپنی ذاتی کوشش' انہماک اور جدّوجہد سے قرآن کے علوم پر گرفت حاصل کی۔ میری اس بات کی گواہی وہ لوگ دیں گے جن کو ڈاکٹر صاحب کے خطابات اور دورۂ ترجمہ قرآن سننے کا اتفاق ہوا ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب بڑی سادہ زبان میں مدلّل طریقے سے تفسیری نکات پیش کرتے تھے' ایسی آسان اور قابلِ فہم تفسیر کہ جس سے لوگوں کو بات سمجھ میں آجائے۔



## ''بیان القرآن'' ڈاکٹر صاحب کے نکاتِ قرآنی کا مجموعہ

مجھے سب سے زیادہ خوشی اس بات کی ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے جو نکاتِ قرآنی ہیں وہ CDs' DVD's اور آڈیو/ویڈیو کیسٹس کے بعد اب ''بیان القرآن'' کے عنوان سے کتابی شکل میں پیش کیے جا رہے ہیں —— بیان القرآن کی پہلی جلد کا جو مقدمہ ''تعارفِ قرآن'' کے عنوان سے ہے وہ پڑھنے کے قابل ہے اور مجھے امید ہے کہ ''بیان القرآن'' ان شاءاللہ جلد پایۂ تکمیل کو پہنچے گا☆۔ اس سے بڑھ کر ایک اور چیز بھی میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ انجمن خدام القرآن کو چاہیے کہ وہ ''بیان القرآن'' کی کتابی شکل میں اشاعت کے ساتھ اس کا ترجمہ انگریزی میں کرائے تاکہ انگلینڈ' یورپ اور امریکہ یعنی اہلِ مغرب کا انگریزی دان طبقہ اس سے محروم نہ رہے اور اس سے مستفید ہو سکے۔

یہاں میں ڈاکٹر صاحب کے حوالے سے ایک اور بات عرض کرنا چاہوں گا کہ جماعتِ اسلامی سے علیحدگی کے بعد ایک وقت وہ آیا کہ جب ڈاکٹر صاحب کا تعلق مولانا حمید الدین فراہی اور ان کے خیالات شائع کرنے والے مولانا امین احسن اصلاحی سے قائم ہوا۔ مولانا امین احسن اصلاحی کی تفسیر ''تدبّرِ قرآن'' معروف ہے اور مجھے بھی اس سے استفادہ کرنے کا موقع ملتا ہے۔ جب ڈاکٹر صاحب کا ان سے تعلق قائم ہوا تو میں نے خط میں ڈاکٹر صاحب کو ایک بات لکھی تھی کہ تنظیم اسلامی کے سلسلے میں جو آپ کر رہے ہیں وہ کریں' تاہم آپ کی قیمتی خدمت انجمن خدّام القرآن ہے۔ پھر ایک وقت آیا کہ مولانا امین احسن اصلاحی کے بعد انہوں نے اپنی راہ خود متعیّن کی اور پھر ہمہ وقت قرآن کی طرف مشغول ہوئے۔

## تفسیرِ قرآن آسان نہیں

قرآن پڑھ کے تفسیر بیان کرنا بظاہر بہت آسان معلوم ہوتا ہے' اور آج کل کیا کہنے کہ انٹرنیٹ مفسّرِ قرآن بھی ہے' مفتی بھی ہے' قاضی بھی ہے' الغرض سبھی کچھ ہے اور اس کا پڑھنے والا بڑے وثوق سے کہتا ہے کہ میں نے انٹرنیٹ پر پڑھا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہت ہی مدلّل اور معتبر حوالہ دیا جا رہا ہے۔ جہاں تک قرآن پاک کی تفسیر کا تعلق ہے تو یہ بقولِ جگر شاخِ گل بھی ہے' تلوار بھی ہے۔ لوگ جتنا آسان سمجھتے ہیں اتنا آسان نہیں ہے۔ قرآن پاک کی تفسیر بیان کرنے کے لیے اس کے کچھ مبادی ہیں' اس کے کچھ اصول ہیں۔ جب تک ان اصولوں پر

☆ الحمدللہ! بیان القرآن کی تین جلدیں (سورۃ التوبہ تک) کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہیں۔ (مرتب)

مکمل گرفت نہیں ہوگی وہ تفسیر قابل اعتبار نہیں ہوگی۔ تو اس لحاظ سے ڈاکٹر صاحب قابلِ تعریف ہیں (اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے) کہ انہوں نے جس طرح سے قرآن پاک کی خدمت کی' اس کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا' وہ ڈاکٹر صاحب کا طرۂ امتیاز ہے۔ یہ دو دھاری تلوار تھی لیکن الحمدللہ ڈاکٹر صاحب اس سے بحسن وخوبی عہدہ برآ ہوئے ہیں۔

یہ بات یاد رکھیں کہ اگر قلبِ سلیم نہ ہو اور اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہی کا احساس نہ ہو تو آدمی بہک جاتا ہے۔ قرآن پاک کی تفسیریں بہت سے لوگوں نے لکھی ہیں۔ ہر مفسّر جو قرآن کی تفسیر بیان کرتا ہے وہ اپنے خیال سے پیش کرتا ہے اور اپنے ذہن کو استعمال میں لاتا ہے۔ لیکن اگر قلب سلیم نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کا احساس نہیں ہے تو وہ بہک جاتا ہے اور پھر جیسے وہ خود بہکتا ہے تو لوگوں کو بھی بہکاتا ہے۔ میں چند مثالیں دوں گا کہ ڈاکٹر صاحب کا منہجِ تفسیر کیا تھا اور وہ کیسے اور کیوں کامیاب ہوگئے!

## تفسیرِ قرآن کے لیے صرف عربی کا جاننا کافی نہیں

آج کل کا زمانہ ایسا ہے کہ ہر عربی جاننے والا سمجھتا ہے کہ وہ مفسّر ہے۔ حیرت مجھے اس بات کی ہوتی ہے کہ ہر عربی دان اردو کی کتابیں پڑھ کے یا وہ تفاسیر جن کا اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے' ان کو پڑھ کر اپنے آپ کو مفسّر سمجھنے لگا ہے۔ عجیب بات ہے کہ میں عربی جانتا ہوں لیکن میں میڈیکل اصطلاحات کو صحیح طور پر بیان نہیں کرسکتا۔ اسی طرح میں قانونی اصطلاحات اور اس کی پیچیدگیوں کو نہیں بیان کرسکتا۔ اگر دوسرے فنون کے اندر اس اصول کو مانا جاتا ہے تو قرآن کی تفسیر میں بھی اس اصول کو ماننا چاہیے کہ قرآن کی تفسیر اس کے اصول ومبادی جانے بغیر اور اس علم کو حاصل کیے بغیر ممکن نہیں ہے۔ ؎

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی!

لیکن اس لحاظ سے ڈاکٹر صاحب کی امتیازی شان ہے' یعنی ان کی ذات اس اصول کا استثناء ہے۔ وہ اگرچہ کسی خاص مدرسے کے تعلیم یافتہ نہیں تھے لیکن اللہ کا ان پر بڑا احسان ہے کہ اللہ نے ان کو قلب سلیم کی وجہ سے صحیح راستے پر رکھا۔ چند مثالوں سے آپ کو ان کا منہجِ تفسیر سمجھ میں آجائے گا۔ فقہ ان کا موضوع نہیں تھا' لیکن اس کے باوجود ان کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ تفسیر یا آیات کے مطالب بیان کرنے میں جمہور کی فقہی آراء سے روگردانی نہ ہو۔



بات کہنے کی یہ ہے کہ قرآن پاک کا اپنا منفرد اسلوب ہے۔ قرآنی آیات میں سے بعض آیات دوسری آیات کی تفسیر بیان کرتی ہیں اور پھر مسئلہ سے متعلق مختلف احادیث ہوتی ہیں۔ قرآن پاک کی ایک آیت کی تفسیر دوسری جگہ پر موجود آیت بیان کر رہی ہے۔ اس لیے کسی موضوع یا عنوان پر اگر آپ کو قرآن پاک کی ایک آیت نظر آتی ہے تو اس ایک آیت پر فیصلہ نہ کر دیا جائے' بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس موضوع سے متعلق قرآن پاک میں جہاں جہاں آیات آئی ہیں ان کی جانچ پڑتال کی جائے اور پھر اس کے بعد ان آیات کی تفسیر بیان کی جائے۔ عام طور پر قدیم مفسّرین کا یہی دستور رہا ہے۔ تو یہ بات واضح ہوگئی کہ قرآن پاک کی تفسیر اور مطالب بیان کرنے کے لیے صرف عربی جاننا کافی نہیں ہے' اس لیے کہ صرف عربی لغت سے کام نہیں بن سکتا۔ قرآن کی اپنی اصطلاحات ہیں اور قرآن میں بعض چیزیں معمولی سمجھنے کی ہیں لیکن انہیں بھی بآسانی سمجھا نہیں جاسکتا۔ خاص طور سے اگر قرآن کا ترجمہ انگریزی میں کیا جائے یا یورپی زبانوں میں سے کسی زبان میں کیا جائے تو وہ اور بھی زیادہ ''غریب'' ہوتی ہیں' یعنی ان زبانوں میں قرآنی مطالب کو بعینہٖ بیان کرنا بہت مشکل کام ہے۔ البتہ اردو اور فارسی چونکہ عربی سے قریب ہیں اس لیے ان میں مطالبِ قرآن آجاتے ہیں۔ قرآن کا ترجمہ انگریزی یا جرمن یا فرنچ میں ہو تو ان میں قرآن کے ایک لفظ کی مکمل تشریح ایک لفظ سے نہیں ہوتی' اس لیے ہر ہر لفظ کی بھی پوری تشریح کرنی پڑتی ہے' مثلاً ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۝﴾ میں ''ربّ'' کا ترجمہ انگریزی میں عام طور پر Lord سے کیا جاتا ہے' حالانکہ عربی کے اندر ''ربّ'' کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ اس لفظ میں تمام صفات جمع ہیں' اس میں Lord بھی ہے' Sustainer بھی ہے' Cherisher بھی ہے۔ اسی لیے عربی میں head of the family کو ''ربّ البیت'' اور house wife کو ''ربّۃ البیت'' کہتے ہیں۔ تو اس لحاظ سے میں یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ قرآن پاک کی تفسیر بیان کرنے کے لیے صرف عربی کا جاننا کافی نہیں ہے۔

## اس حوالے سے ایک لطیفہ

قرآن کی تفسیر اور اس کے مطالب کو درست انداز میں بیان کرنے کے لیے صرف عربی کا جاننا کافی نہیں ہے۔ اس حوالے سے میں آپ کو ایک لطیفہ سناتا ہوں۔ ہندوستان کے ایک بیوروکریٹ مقبول صاحب عراق میں چھ ماہ رہ کر واپس آئے تو انہوں نے کہا کہ میں قرآن

پاک کی تفسیر بیان کرسکتا ہوں‘ اس لیے کہ میں عربی جانتا ہوں۔ انہوں نے روزے کے بارے میں قرآن کی آیت ﴿اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ﴾(البقرۃ:۱۸۴) کا ترجمہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ جمع کثرت اور جمع قلت کا مسئلہ ہے اور ’’اَیَّامًا‘‘ کا اطلاق ایک سے لے کر ۹ تک ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رمضان کے روزے صرف ۹ ہی دن کے ہوئے—— آپ کو حیرت ہوگی کہ اس وقت اس کا جواب غلام احمد پرویز نے دیا تھا۔ اس کے بعد میرے والد محترم نے اس مضمون میں مزید اضافہ کیا اور یہ لکھا: ایک غیر مولوی کا جواب تو آپ سن چکے‘ اب ایک مولوی کا جواب بھی سن لیجیے۔ اس میں انہوں نے جمع قلت اور جمع کثرت کے اصول وقواعد بیان کیے تھے اور پھر یہ کہا کہ اگر اس چیز کو مان لیا جائے کہ ایام کے معنی ۹ دن کے ہیں تو نمعلوم ہمارے مقبول صاحب اس آیت کا کیا ترجمہ کریں گے جس میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَتِلْكَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُهَا بَیْنَ النَّاسِ ۚ﴾(آل عمران:۱۴۰) ’’یہ تو دن ہیں جن کو ہم لوگوں میں اُلٹ پھیر کرتے رہتے ہیں‘‘۔ اس کا مطلب ہے کہ اللہ کے قبضۂ قدرت میں صرف نو ہی دن ہیں‘ باقی اس کے قبضے میں نہیں ہیں۔ تو میں کہنا یہ چاہ رہا تھا کہ قرآن کی تفسیر کے لیے صرف عربی کافی نہیں بلکہ اس کے لیے قرآن کے جو علوم ہیں ان کے جاننے کی بھی ضرورت ہے۔

## ڈاکٹر صاحب کا تفسیری منہج اور اس کی خصوصیات

اب میں اس طرف آتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کا تفسیری منہج کیا تھا‘ اس کی خصوصیات کیا تھیں جن کی بنا پر ڈاکٹر صاحب کامیاب ہوئے اور لوگوں میں اتنے مقبول ہوئے کہ ایک بہت بڑی جماعت ان کے نقش قدم کی پیروی کر رہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے تفسیری منہج کی درج ذیل خصوصیات ہیں:

(۱) تفسیر کا ایک اصول ہے: القرآن یفسّر بعضہ بعضًا کہ قرآن کی ایک آیت دوسری آیت کی تفسیر کرتی ہے۔ اگر آپ ڈاکٹر صاحب کے دروس سنیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کو ایک آیت کی تفسیر سے متعلق دوسری آیات حفظ ہیں۔ وہ جب ایک آیت کے تحت کسی موضوع کو بیان کرتے تھے تو اس کے استشہاد میں قرآن کی دوسری آیت بیان کرتے تھے‘ یعنی ان کی تفسیر من مانی تفسیر نہیں تھی بلکہ قرآن پاک کی جس آیت کو بیان کیا‘ قرآن کی دوسری آیت سے اس کا استشہاد بھی بیان کیا۔

(۲) ان کے تفسیری منہج کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ قرآن پاک کی جو آیت بیان کی جا رہی



ہے اس کا استشہاد احادیث سے بھی کرتے تھے۔ ’’بیان القرآن‘‘ میں اگر آپ دیکھیں تو جگہ جگہ انہوں نے احادیثِ نبویہؐ کا ذکر کیا ہے۔

(۳) ان کے تفسیری منہج کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے ہمیشہ خیال رکھا کہ کوئی بات جمہور علماء کے خلاف نہ ہو۔ ان کو اس چیز کا شدت سے احساس ہو گیا تھا کہ جمہور کی رائے سے ہٹ کر اپنی پیشین گوئی گمراہی کا باعث بنتی ہے‘ یعنی اپنے زرخیز ذہن سے کوئی ایسی بات کہہ دینا جو جمہور کی رائے کے خلاف ہو‘ وہ گمراہی کا باعث ہے۔

(۴) ڈاکٹر صاحب کے تفسیری منہج کے حوالے سے ایک بات یہ بھی قابلِ ستائش ہے کہ ان کے بیانات وخطابات میں جابجا اقبال کے شعروں کا برمحل تذکرہ ملتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو اقبال سے عشق تھا۔ جہاں وہ اپنی تفسیر اور رائے پر استشہاد دیتے تھے قرآن پاک کی آیتوں کا اور احادیث کا وہاں جابجا اقبال کے اشعار بھی quote کرتے تھے۔ اور یہی بات لوگوں کی دلچسپی کا باعث ہوتی تھی۔

(۵) ڈاکٹر صاحب کے تفسیری منہج کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے تفسیرِ قرآن میں حق بات کے کہنے میں کبھی کسی کی پروا نہیں کی اور اس کی کئی مثالیں ہیں۔ میں فی الحال ان مثالوں کا ذکر تو نہیں کروں گا لیکن یہ مجھے معلوم ہے اور میری گفتگو بھی ان سے اس مسئلے پر ہوئی ہے۔ انہوں نے تفسیر کے سلسلے میں جو بات حق ہے اور احادیث میں بھی اس کا ذکر ہے‘ اسے بلاخوف لومۃ لائم کہ کسی کو اس سے تکلیف پہنچے گی‘ اس کا ذکر کیا۔ اور اس طرح بات کے کہنے میں ان کو ایک بار نہیں‘ کئی بار بھاری قیمت بھی ادا کرنی پڑی۔

(۶) ڈاکٹر صاحب کی ایک اور نمایاں خصوصیت جو انہیں اوروں سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے قرآن کے مطالب بیان کرنے میں اپنی میڈیکل کی اصطلاحات سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور جدید انگریزی خواں ذہن کو نہ صرف متاثر کیا بلکہ ان کی صحیح راہنمائی بھی کی۔ اس لحاظ سے آپ دیکھیں گے کہ ان کی تفسیر ’’بیان القرآن‘‘ میں جابجا انگریزی کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔

## ڈاکٹر صاحب کے تفسیری منہج کی چند مثالیں

اب میں ڈاکٹر صاحب کے تفسیری منہج کو واضح کرنے کے لیے چند مثالیں دیتا ہوں:

① **آلِ عمران:۱۷**: ﴿اَلصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰدِقِیْنَ وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْمُنْفِقِیْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِیْنَ بِالْاَسْحَارِ ﴿۱۷﴾﴾۔ ڈاکٹر صاحب نے اس آیت کا ترجمہ بایں الفاظ کیا ہے:

''صبر کرنے والے' اور راست باز' اور فرماں بردار' اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے' اور اوقاتِ سحر میں مغفرت چاہنے والے۔''

اس آیت میں ایک لفظ ہے ''اَسحار''۔ اب اگر کوئی قرآن کی تفسیر لغت کی مدد سے کرنا چاہے گا تو مشکل میں پڑ جائے گا' جیسے بعض مفسّرین نے لغت کی مدد سے اس کا ترجمہ کیا ہے: دل کی گہرائی' یعنی ''اَلْمُسْتَغْفِرِیْنَ بِالْاَسْحَارِ'' کا مطلب ہوا: ''دل کی گہرائی سے استغفار کرنے والے'' حالانکہ اس کا مناسب مطلب وہی ہے جو ڈاکٹر صاحب نے کیا ہے: ''سحری کے وقت اللہ سے مغفرت مانگنے والے''۔ یہاں جس چیز کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں وہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا طرۂ امتیاز یہ تھا کہ الحمدللہ وہ جمہور کی رائے سے ان مسائل میں الگ نہیں ہوئے۔ سوچنا الگ چیز ہے' نتیجہ نکالنا الگ چیز ہے' لیکن قرآن کی تفسیر بیان کی جائے گی تو اللہ کے سامنے جوابدہی کے احساس اور قلب سلیم کے ساتھ ہوگی۔

② **الرحمٰن: ٦**: ﴿وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ ۝٦﴾۔ اس آیت کا ترجمہ کیا ہوگا؟ ''نجم'' کا معنی ہے ستارہ اور ''شجر'' کا معنی ہے درخت۔ اب اس آیت میں معنی کیا ہوں گے کہ ''ستارے اور درخت سجدہ کرتے ہیں'' یا کچھ اور معنی ہوں گے؟ یہاں ایک بات نوٹ کر لیجیے کہ جب بھی کسی آیت کی تفسیر یا ترجمہ بیان کیا جاتا ہے تو اصول یہ ہے کہ پہلے اس آیت کے سیاق وسباق کو دیکھا جائے اور پھر اس کا ترجمہ کیا جائے' جیسے لفظ ''دین'' قرآن میں کئی دفعہ آیا ہے' مثلاً ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝﴾ اور ﴿اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾۔ تو اب ہر جگہ ''دین'' کا ترجمہ سیاق وسباق کو مدنظر رکھ کر کیا جائے گا۔ اسی طرح ''النجم'' کے معنی ''ستارے'' کے علاوہ وہ پودے ہیں جن کی جڑیں نہیں ہوتیں۔ اس اصول کے مطابق سورۃ الرحمٰن کی مذکورہ آیت کا ترجمہ ڈاکٹر صاحب نے بایں الفاظ کیا ہے: ''وہ پودے جن کی جڑیں نہیں ہوتیں اور درخت' سب اللہ کے سامنے سجدے میں ہوتے ہیں۔''

③ **الغاشیة: ١٧ تا ٢٠**: یہ آیات اور ان کا ترجمہ ملاحظہ کیجیے:

﴿اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ۝١٧ وَاِلَى السَّمَآءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ۝١٨ وَاِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ۝١٩ وَاِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ ۝٢٠﴾

''تم دیکھتے نہیں کہ ابل کیسے پیدا کیا گیا' اور آسمان کیسے بلند کیا گیا' اور پہاڑ کیسے نصب کیے گئے' اور زمین کیسے بچھائی گئی؟''

اس میں جو توجہ طلب لفظ ہے وہ ''اِبِلْ'' کا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہاں ابل کے کیا



معنی ہیں؟ ایک صاحب نے قرآن کا ترجمہ انگریزی میں کیا ہے اور ابل کے معنی بادل کیے ہیں' حالانکہ ابل کے معنی عام طور پر اونٹ کے ہوتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ انہوں نے cloud (بادل) کا لفظ کیوں استعمال کیا۔ انہوں نے یہ ترجمہ اس بنیاد پر کیا کہ اگلی آیت میں چونکہ آسمان کا ذکر ہے اس لیے انہوں نے سوچا کہ اس کا تعلق اونٹ سے کیا ہوگا؟ تو انہوں نے اس کا ترجمہ بادل کر دیا۔ ان کی نظر اس پر نہیں گئی کہ قرآن پاک تدریج سے ذکر کر رہا ہے' پہلے صعود کا اور پھر نزول کا۔

یہاں اونٹ کا تذکرہ اس لیے کیا گیا کہ اونٹ عربوں کے ہاں بڑی معلوم اور بڑی اہم چیز تھی۔ اونٹ کی خلقت' اس کا رہنا سہنا' چودہ چودہ' پندرہ پندرہ دن پانی کے بغیر رہنا' یہ سب ان کے لیے باعثِ تعجّب تھا۔ اللہ تعالیٰ تدریج کے ساتھ بیان فرما رہے ہیں کہ اونٹ کو دیکھو کیسے پیدا کیا گیا' اور آسمان کو دیکھو کیسے پیدا کیا گیا' اور پھر پہاڑوں کو دیکھو کیسے پیدا کیا گیا' اور پھر زمین کو دیکھو کیسا پیدا کیا گیا۔ اگر اس تناظر میں دیکھا جائے تو آسانی سے بات سمجھ میں آ جائے گی۔

④ **آل عمران: ٧**: تفسیرِ قرآنی کے حوالے سے ایک بہت بڑا مغالطہ متجدّدین کے ہاں ہوا ہے اور اب بھی لوگ کر رہے ہیں۔ سورۂ آل عمران کی بڑی مشہور آیت ہے:

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ﴾

''وہی ہے جس نے آپؐ پر یہ کتاب نازل کی' اس میں کچھ آیات محکم ہیں اور وہی اصل کتاب ہیں اور کچھ دوسری آیات متشابہہ ہیں۔''

آیت محکمہ تو سب کو معلوم ہے' ڈاکٹر صاحب نے بھی اس کی بڑی عمدہ تشریح کی ہے☆ اور متشابہات کا بھی ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ متشابہات سے مراد وہ آیات ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کی بحث ہے' موت کے بعد کا قصّہ ہے' آخرت کا قصہ ہے' عالمِ برزخ کی کیفیات کا ذکر ہے' جنّت ودوزخ کا ذکر ہے یا جن میں موت کے بعد کی کیفیات کا تذکرہ ہے۔ ان تمام چیزوں کا معاملہ امورِ غیب سے ہے اور یہ اُمورِ غیب' غیب میں ہوتے ہیں تاوقتیکہ انسان کی موت واقع نہ ہو جائے۔ ان متشابہات کے حوالے سے لوگوں نے فتنہ پھیلایا ہے اور وہ ان آیاتِ متشابہات سے کوئی نہ کوئی مطلب ضرور نکالتے ہیں۔ اسی لیے

☆ ''محکم'' اور پختہ آیات وہ ہیں جن کا مفہوم بالکل واضح ہو اور جنہیں اِدھر اُدھر کرنے کی گنجائش نہ ہو۔'' (بیان القرآن' ج ۲' ص ۱۲) (اضافہ از مرتب)

قرآن پاک صاف صاف کہہ رہا ہے: ﴿فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ﴾ یعنی وہ لوگ جن کے دلوں میں کجی ہوتی ہے' ضعف ہوتا ہے' جن کے دلوں میں اس حوالے سے کوئی شبہ پیدا ہوتا ہے تو وہ ان متشابہ آیات کے پیچھے لگ جاتے ہیں اور پھر وہ اس کی من پسند تفسیر کرتے ہیں۔ ان کا مقصد فتنہ پھیلانے کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر صاحب نے اس بارے میں ''بیان القرآن'' میں لکھا ہے کہ ان متشابہ آیات کے پیچھے پڑنے والے چاہتے ہیں کہ کوئی خاص بات نکالی جائے تاکہ اپنی ذہانت و فطانت کا ڈنکا بجایا جاسکے' یا کوئی فتنہ اٹھایا جائے' کوئی فساد پیدا کیا جائے۔ جن کا اپنا ذہن ٹیڑھا ہو چکا ہے وہ اس ٹیڑھے ذہن کے لیے قرآن سے کوئی دلیل چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے جس طرح سے اس کی تشریح کی ہے یہ قابل تعریف چیز ہے اور اس سے آپ کو محسوس ہوگا کہ ڈاکٹر صاحب کی نظر کہاں تک گئی ہے۔

اسی طرح متجدّدین نے تفسیرِ قرآن کے حوالے سے اس آیت کے اگلے ٹکڑے ﴿وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ﴾ کے حوالے سے ایک اور عجیب جرأت کی ہے۔ اس آیت میں ''تَاْوِیْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ'' کو اگر آپ ''وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ'' سے ملا دیں تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ ان آیاتِ متشابہات کی تاویل یا اللہ جانتا ہے یا راسخون فی العلم جانتے ہیں۔ متشابہات کی بحث بڑی نازک ہے۔ اس سلسلے میں بڑی گمراہی پھیلتی ہے' پھیل سکتی ہے اور پھیل رہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس آفت سے آسانی کے ساتھ بچ کے نکلے ہیں۔ انہوں نے ان دونوں ٹکڑوں کا الگ الگ ترجمہ کیا ہے۔ ﴿وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ۘ﴾ ''حالانکہ ان کا حقیقی مفہوم اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔'' ﴿وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ﴾ ''اور جو لوگ علم میں راسخ ہیں وہ یوں کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اس کتاب پر' یہ کُل کا کُل ہمارے ربّ کی طرف سے ہے''۔ اسی سلسلے میں انہوں نے اقبال کا شعر بھی پیش کیا ہے:

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے!

یہاں بھی میں اُسی بات کی طرف اشارہ کر رہا ہوں جو میں نے پہلے بھی بیان کی کہ ڈاکٹر صاحب کی سلامتیٔ فکر ایسی تھی کہ ایک تو وہ جمہور کی رائے سے نہیں ہٹے اور پھر انہوں نے دلیل



بھی دی اور اپنی دلیل کو پھر مدلّل کیا اقبال کے شعر سے کہ عقل خود منزل نہیں ہے بلکہ یہ تو صرف روشنی دیتی ہے منزل کی طرف۔ یہ ہیں ڈاکٹر صاحب کے الفاظ! اس وقت مجھے اسی حوالے سے ایک اور شعر یاد آیا:

عقل سے تم مشورہ نہ کرنا
تراش دے گی ہزار بہانے

یہ منزل وہ ہے جہاں عقل کام نہیں دیتی۔ یہ ایسی منزل ہے جہاں عقل کی آخری حد ختم ہو جاتی ہے اور وہاں پھر دوسری چیزیں اس کو سنبھالتی ہیں۔

⑤ **المائدۃ:۶**: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَیْدِیَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَیْنِ ؕ﴾ کے حوالے سے بھی جو ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے وہ قابلِ ستائش ہے۔ اس آیت میں اگر ''اَرْجُلَكُمْ'' کو لام کے کسرہ کے ساتھ پڑھا جائے ''اَرْجُلِكُمْ'' تو اس سے مراد ہوگا کہ اپنے سروں کا مسح کرو اور اپنے پیروں کا بھی مسح کرو۔ قرآن کی اور بھی بہت سی ایسی آیات ہیں جس میں اس قسم کا جملہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس پر جو لکھا ہے وہ ملاحظہ کریں:

''یہاں پر واضح رہے کہ اَرْجُلَكُمْ اور اَرْجُلِكُمْ دونوں قراءتیں مستند ہیں' لہٰذا اہلِ تشیّع اس کو مستقلاً اَرْجُلِكُمْ پڑھتے ہیں اور ان کے نزدیک اس میں پاؤں پر مسح کا حکم ہے۔ چنانچہ وہ ﴿وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلِكُمْ﴾ کا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں: ''اور مسح کر لیا کرو اپنے سروں پر بھی اور اپنے پاؤں پر بھی''۔ لیکن اہلِ سنت کے نزدیک یہ اَرْجُلَكُمْ ہے اور اِلَى الْكَعْبَیْنِ کے اضافے سے یہاں پاؤں کو دھونے کا حکم بالکل واضح ہو گیا ہے۔ اگر صرف مسح کرنا مطلوب ہوتا تو اس میں کوئی حد بیان کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ لہٰذا اِلَى الْكَعْبَیْنِ کی شرط سے یہ ٹکڑا ﴿فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَیْدِیَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ﴾ کے بالکل مساوی ہو گیا ہے۔ جیسے ہاتھوں کا دھونا ہے کہنیوں تک' ایسے ہی پاؤں کا دھونا ہے ٹخنوں تک۔ اس حکم میں وضو کے فرائض بیان ہوئے ہیں۔'' (بیان القرآن' ج ۲' ص ۲۴۹)

⑥ **آلِ عمران:۳۱'۳۲**: ڈاکٹر صاحب کا ایک اور نکتہ بڑا دلچسپ ہے' جو مجھے بے حد پسند آیا۔ ڈاکٹر صاحب نے سورۂ آلِ عمران کی بہت مشہور آیت:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَیَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ

وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۱﴾ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۲﴾ ﴾

کی تشریح میں فرمایا کہ یہ دو آیتیں اس اعتبار سے بہت اہم ہیں کہ ان میں رسول اللہ ﷺ کے لیے دو الفاظ آئے ہیں۔ایک تو ہے اطاعت' اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ.....﴾ ''اطاعت کرو اللہ کی اور رسول کی' لیکن اگر تم اس سے روگردانی کرو گے تو اللہ تعالیٰ انکار کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا''۔جبکہ اس سے پہلی آیت میں اتباع کا ذکر ہے۔ فرمایا: ﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ .....﴾ ''اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو' اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا۔اور اللہ بخشنے والا' رحم فرمانے والا ہے''۔اس آیت میں ''اتباع'' کا ذکر ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے ان دونوں الفاظ ''اطاعت'' اور ''اتباع'' میں اس طرح فرق بیان کیا ہے:

''اطاعت اگر نہیں ہے تو یہ کفر ہے۔ چنانچہ اطاعت تو لازم ہے اور وہ بھی دلی آمادگی سے' مارے باندھے کی اطاعت نہیں۔لیکن اطاعت کس چیز میں ہوتی ہے؟ جو حکم دیا گیا ہے کہ یہ کرو وہ آپ کو کرنا ہے۔اتباع اس سے بلند تر شے ہے۔انسان خود تلاش کرے کہ آنحضور ﷺ کے اعمال کیا تھے اور ان پر عمل پیرا ہو جائے' خواہ آپ ﷺ نے ان کا حکم نہ دیا ہو۔گویا اتباع کا دائرہ اطاعت سے وسیع تر ہے۔انسان کو جس کسی سے محبت ہوتی ہے وہ اُس سے ہر طرح سے ایک مناسبت پیدا کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ وہ اس کے لباس جیسا لباس پہننا پسند کرتا ہے' جو چیزیں اس کو کھانے میں پسند ہیں وہی چیزیں خود بھی کھانا پسند کرتا ہے۔ یہ ایسی چیزیں ہیں جن کا حکم نہیں دیا گیا لیکن ان کا التزام پسندیدہ ہے.....اتباع کے ضمن میں یہ بات بھی لائق توجہ ہے کہ اگرچہ دین کے کچھ تقاضے ایسے ہیں کہ انہیں جس درجے میں محمد رسول اللہ ﷺ نے پورا فرمایا اس درجے میں پورا کرنا کسی انسان کے بس میں نہیں ہے' پھر بھی اس کی کوشش کرتے رہنا اتباع کا تقاضا ہے.....البتہ جہاں تک ''اطاعت'' کا تعلق ہے اس میں کوتاہی قابل قبول نہیں۔ جہاں حکم دے دیا گیا کہ یہ حلال ہے' یہ حرام ہے' یہ فرض ہے یہ واجب ہے' وہاں حکم عدولی کی گنجائش نہیں۔اگر اطاعت ہی سے انکار ہے تو اسے قرآن کفر قرار دے رہا ہے۔

اتباع کا معاملہ یہ ہے کہ نبی ﷺ کا اتباع کرنے والا اللہ کا محبوب بن جاتا ہے۔ یہاں



ارشاد فرمایا کہ اے نبی ﷺ! اہلِ ایمان سے کہہ دیجیے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میرا اتباع کرو' میری پیروی کرو۔ دیکھو' میرے شب و روز کیا ہیں؟ میری توانائیاں کن کاموں پر لگ رہی ہیں؟ دنیا کے اندر میری دلچسپیاں کیا ہیں؟ ان معاملات میں تم میری پیروی کرو۔اس کے نتیجے میں تم اللہ تعالیٰ کے ''محبّ'' سے بڑھ کر ''محبوب'' بن جاؤ گے اور اللہ تمہارے گناہ بخش دے گا۔وہ یقیناً غفور اور رحیم ہے۔باقی اطاعت تو اللہ اور اس کے رسولؐ کی بہرصورت کرنی ہے۔اگر یہ اس اطاعت سے بھی مُنہ موڑیں تو اللہ تعالیٰ کو ایسے کافر پسند نہیں ہیں۔'' (بیان القرآن' جلد دوم' ص ۲۷)

## ڈاکٹر صاحب سے بے تکلفی

ایک بات کا ذکر ضروری ہے کہ لاہور آنے میں میرے لیے دو چیزیں باعثِ کشش ہیں' ایک ہے جامعہ اشرفیہ۔ جامعہ اشرفیہ سے میرا بڑا جذباتی تعلق ہے اور اسے تو میں اپنا گھر سمجھتا ہوں۔میری دوسری کشش ڈاکٹر صاحب کے حوالے سے تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر صاحب سے تعلقات اتنے استوار ہو چکے تھے' اتنی بے تکلفی ہو چکی تھی کہ ہر موضوع پر گفتگو ہو جاتی تھی۔ ''سیرت النبی ﷺ'' میرے والد ماجد سید سلیمان ندوی کی تالیف ہے۔اس میں ایک جلد عبادات سے متعلق ہے۔اسی سلسلے میں خاص طور پر جہاں جہنم کا ذکر ہے' اس پر ڈاکٹر صاحب سے بات ہوئی۔ایک زمانہ تھا کہ میرے والد علامہ ابن القیم کے تتبع میں خلود فی النار کے قائل نہیں تھے' لیکن بعد میں ان کو احساس ہوا کہ یہ رائے جمہور کی رائے کے خلاف ہے تو انہوں نے اس سے رجوع کر لیا۔ جب میں پچھلی بار آیا تھا تو ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ سید صاحب نے عدمِ خلود سے رجوع کر لیا تھا؟ میں نے کہا: ہاں کر لیا تھا۔انہوں نے پوچھا: آپ کیوں عدمِ خلود کو ماننا چاہتے ہیں؟ میں نے کہا: آپ ذرا اس بات کو سوچیے کہ ہم یہاں دنیا میں بھی نقصان اٹھائیں اور وہاں بھی نقصان اٹھائیں؟ اس طرح تو ہمارا بہت نقصان ہوگا۔ بہرحال ان سے ہر موضوع پر گفتگو ہوتی تھی اور میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کے ذہن میں' ان کے فکر میں وہ کجی نہیں تھی جو ﴿فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ.....﴾ میں بیان ہوئی ہے۔

## اختتامی کلمات

بہت سے مفسّر ایسے ہیں کہ جن کا تکیہ کلام ہی یہ ہوتا ہے کہ میں یہ کہہ رہا ہوں اور میرا فرمایا ہوا قول مستند ہے' لیکن ڈاکٹر صاحب میں ایسی کوئی بات نہیں تھی اور پھر انہوں نے اپنے

اسلاف‘ چاہے وہ شاہ ولی اللہ ہوں یا امام غزالی ہوں یا جو بھی ہوں‘ سے اپنا رشتہ توڑا نہیں۔ سلامتیٔ فکر کے لیے یہ چیز ضروری ہے کہ آپ اپنے کو عقلِ کُل نہ سمجھ لیں۔ اس سلسلے میں جو چیزیں انہوں نے بیان کی ہیں وہ قابل قدر ہیں‘ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے اور ان کی قبر کو نور سے بھر دے۔ ان کے یہ تذکیری نکات ان کے لیے اور ان کے ورثاء اور کارکنان کے لیے صدقۂ جاریہ ہیں جو اس تحریک کو چلانے والے ہیں۔ اس لیے کہ یہ ایسا ثواب ہے جو جاری رہے گا۔ اسی لیے میں نے عرض کیا کہ جلد از جلد ’’بیان القرآن‘‘ کی کتابی شکل میں تکمیل کی جائے اور جتنی جلدیں اس وقت تک مکمل ہو چکی ہیں‘ کوشش کی جائے کہ ان کا ترجمہ انگریزی میں ہو سکے۔ اس لیے کہ انگریزی میں اس قسم کا لٹریچر پورے یورپ میں بہت کم ہے۔ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کے درجات کو بلند کرے‘ ان کا تو مشن ہی تعلّم و تعلیمِ قرآن تھا۔ بقول اقبال ؎

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مؤمن
قاری نظر آتا ہے‘ حقیقت میں ہے قرآن!

اور ڈاکٹر صاحب اپنے خطابات میں اس شعر کا بھی ذکر کیا کرتے تھے: ؎

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی است

یعنی اپنے آپ کو رسول اللہ ﷺ کی طرف لے جاؤ اور اگر اس منزل کو نہیں پہنچتے ہو تو تمام بولہبی ہے۔ اسی طرح یہ شعر بھی وہ اکثر سنایا کرتے تھے: ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کو قبول فرمائے اور ان کی جملہ خدمات کو ان کے لیے صدقۂ جاریہ بنائے۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو بھی اس مجلس میں شریک ہونے کی جزائے خیر عطا فرمائے۔ آخر میں وہی بات جو میں نے شروع میں کہی تھی: ﴿هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ۝﴾ کہ احسان کا بدلہ احسان کے سوا کچھ نہیں!! ❁❁❁

میثاق‘ حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔



## بقیہ: آخری عشرہ: دوزخ سے نجات

’’ازواجِ مطہرات ؓ کا اعتکاف مسجدِ نبوی میں نہیں بلکہ اپنے حجروں میں ہی ہوتا تھا۔ تمام ازواجِ مطہرات ؓ کے حجرے مسجد نبوی کے ساتھ ساتھ تھے اور ہر ایک کا دروازہ مسجد کے اندر کھلتا تھا۔ نبی ﷺ ازواجِ مطہرات میں سے جس کے ہاں بھی قیام رکھتے تھے وہاں سے آپ ﷺ مسجد کے اندر تشریف لاتے تھے۔ چونکہ یہ حجرے مسجد سے متّصل تھے اس لیے ازواجِ مطہرات ؓ کو مسجد کے اندر آنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ویسے بھی عورتوں کا اعتکاف مسجد میں نہیں ہوتا‘ بلکہ گھروں ہی میں ہوتا ہے۔ اس لیے ازواجِ مطہرات ؓ بھی رمضان کے آخری عشرے میں اپنے اپنے حجروں میں اعتکاف کرتی رہیں‘‘۔ (کتاب الصوم‘ ص ۲۶۸)

واضح رہے کہ اعتکاف مرد کا ہو یا عورت کا‘ اس میں روزہ ضروری شرط ہے۔

❁❁❁

## بقیہ: اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ

### عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ

آخری آیت کی توضیح کرتے ہوئے صاحبِ تفہیم القرآن لکھتے ہیں:

’’یعنی انسان اصل میں بالکل بے علم تھا‘ اسے جو کچھ بھی علم حاصل ہوا اللہ کے دینے سے حاصل ہوا۔ اللہ تعالیٰ ہی نے جس مرحلے پر انسان کے لیے علم کے جو دروازے کھولنے چاہے وہ اس پر کھلتے چلے گئے‘ یہی بات ہے جو آیت الکرسی میں اس طرح فرمائی گئی: ﴿وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ﴾ ’’اور لوگ اس کے علم میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتے سوائے اس کے جو وہ خود چاہے‘‘۔ (البقرۃ:۲۵۵) جن چیزوں کو بھی انسان اپنی علمی دریافت سمجھتا ہے درحقیقت وہ پہلے سے اس کے علم میں نہ تھیں‘ اللہ تعالیٰ ہی نے جب چاہا ان کا علم اسے دیا بغیر اس کے کہ انسان یہ محسوس کرتا کہ یہ علم اللہ اسے دے رہا ہے۔‘‘ (تفہیم القرآن‘ جلد ششم)

❁❁❁

# تاریخ کی قرآنی تعبیر

## ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی کتاب ''استحکامِ پاکستان'' پر تبصرہ

از: سراج منیر' ڈائریکٹر ادارہ ثقافت اسلامیہ

اواخر مارچ ۱۹۸۶ء میں مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام منعقدہ ''محاضراتِ قرآنی'' میں محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کی تصنیف ''استحکامِ پاکستان'' پر دیگر مقررین و مقالہ نگار حضرات کے علاوہ محترم سراج منیر (مرحوم و مغفور) ڈائریکٹر ادارہ ثقافتِ اسلامیہ نے بھی تبصرہ کرتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار فرمایا تھا' جسے میثاق جولائی ۱۹۸۶ء میں شائع کیا گیا تھا۔ بعض احباب نے توجہ دلائی ہے کہ موجودہ عالمی سیاسی صورت حال میں پاکستان کے کردار کے اعتبار سے یہ تحریر خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔ لہٰذا اسے میثاق کے صفحات میں ''قندِ مکرر'' کے طور پر شائع کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

جناب صدر محفل' حاضرین گرامی اور جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب!

ہمارا معاملہ تو یہ ہے کہ ہمیں عادت ہے ادبی کتابوں کی تقریبِ رونمائی میں مقالہ پڑھنے یا گفتگو کرنے کی۔ اُس میں ایک آسانی یہ ہوتی ہے کہ ان کتابوں کو پڑھنا کچھ ضروری نہیں ہوتا۔ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ جس ٹائٹل کے ساتھ جو کتاب آئی ہے اُس میں کیا ہوگا۔ کتاب سونگھ کر اس پر تبصرہ کیا جاتا ہے' لیکن ڈاکٹر ابصار احمد صاحب نے مجھے آج ایک مشکل میں ڈال دیا جب انہوں نے مجھے یہ کتاب دی۔ میں نے ذرا ورق گردانی کی تو مجھے احساس ہوا کہ اس کتاب میں فلوک (fluke) نہیں چلے گا' کیونکہ یہ کتاب خود فلوک (fluke) کی بنیاد پر نہیں لکھی گئی' اور دیانت کا تقاضا یہ ہے کہ جتنا تفکر کسی خیال کے پیچھے ہو اتنی توجہ اُس کتاب کا یا اُس خیال کا حق ہوتا ہے۔ لہٰذا جو رائے اب میں یہاں عرض کروں گا وہ اسی بنیاد پر ہوگی' لیکن میں پہلے ہی عرض کر دوں کہ کتاب کو میں نے اتنی توجہ سے نہیں دیکھا جو اُس کا حق ہے۔ ایسی کتابیں



نظر سے گزرتی رہتی ہیں' لیکن اس کتاب میں ایک بات ذرا الگ ہے اور اس پر توجہ ضرور ہونی چاہیے۔ عام طور پر اس طرح کے عنوانات سے جو کتابیں شائع ہوتی ہیں اُن میں یا تو تاریخ کا بیان ہوتا ہے یا جذباتی انداز میں اُسے دیکھنے کی اور پاکستان کے مسائل کو سمجھنے کی پُرخلوص کوشش ہوتی ہے۔ مگر یہاں آغاز جس چیز سے ہوا ہے وہ علمی طور پر بھی ایک بہت قابلِ لحاظ (significant) بات ہے۔

عام طور پر دُنیا میں آج کل اسلام کا تصورِ تاریخ یا قرآن کا تصورِ تاریخ تو بیان ہوتا ہے' لیکن یہ کتاب قرآن کے تصورِ تاریخ سے بحث نہیں کرتی' بلکہ قرآن کے تصورِ تخلیقِ تاریخ سے بحث کرتی ہے۔ بنی اسرائیل کے ذکر کا جو حوالہ ابتدا میں ہے اور اس کے بعد تاریخ کی پوری mechanics کو دیکھنے کا جو نقطۂ نظر ڈاکٹر صاحب نے اختیار کیا ہے اُس میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ انہوں نے حکایاتِ قرآنی کو یا بیاناتِ قرآنی کو کسی تاریخ کے تسلسل اور تاریخ کی mechanics کے طور پر دیکھا ہے اور یہ دیکھنے کی کوشش کی ہے کہ اس mechanics یعنی اس نظامِ تخلیقِ تاریخ کا اطلاق (application) اُمتِ مسلمہ کی حدود میں کس کس طرح ہوگا۔ یہ ایک ایسی بات ہے جس کے بارے میں ہم شاید یہ کہہ سکیں کہ اس سے پہلے کے اُس ادب میں جو دین اور تاریخ کے تصور سے بحث کرتا ہے' دین اور تاریخ کا اتنا مربوط اور عالمانہ (scientifically organised) تصور کہیں اور نگاہ میں نہیں آیا' اور جس بنیاد پر ڈاکٹر صاحب نے پاکستان کی تاریخ سے واقعات کا انتخاب کیا ہے اور انہیں ایک شکل دینے کی کوشش کی ہے اُس سے اندازہ یہ ہوتا ہے کہ یہ ابھی ایک ابتدائیہ ہے۔ کیونکہ قرآن کے تصورِ تخلیقِ تاریخ کو جب ہم موجودہ تاریخ کے حوالے سے دیکھنے کی کوشش کریں اور اس سے نتائج نکالنے کی کوشش کریں تو یہ بات ظاہر ہے کہ کسی بھی نظریے کے مقابلے میں یا کسی بھی انسانی ظن و گمان یا محض انسانی تفکّر کے مقابلے میں ہمارے قدم زیادہ مستحکم زمین پر ہوتے ہیں' اور مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اس سے پہلے پاکستان کی تاریخ کا تجزیہ اس صورت میں کیا گیا ہو کہ اس کے پیچھے ہر جگہ کوئی نہ کوئی قرآنی اصول بلاتعبیر و تفسیر کارفرما ہو۔

یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کتاب میں شروع سے لے کر اخیر تک جو اصول بھی برتے گئے ہیں وہ اصول وہم و گمان کی منطق سے پیدا نہیں ہوئے' بلکہ اُس سرچشمے سے پیدا ہوئے ہیں جسے دنیا میں کوئی حفاظت کے نقطۂ نظر سے' آفاقیت کے نقطۂ نظر سے اور زمانیت اور لازمانیت

کے نقطۂ نظر سے چیلنج کرنے کی پوزیشن میں دیانت کے ساتھ نہیں ہے۔ لیکن یہ بات صحیح ہے کہ جب اس تاریخ کا تجزیہ کیا جائے اور اس پر قرآنی اصولوں کا اطلاق کیا جائے تو یہ انسانی کوشش کی domain ہے‘ لہٰذا اس میں اختلاف بھی ہوسکتا ہے اور خصوصاً تعبیر کی مختلف سطحیں بھی ہوسکتی ہیں۔ مگر جو نقطۂ نظر اس کے بارے میں ڈاکٹر صاحب نے اختیار کیا وہ عہد جدید میں تاریخ کے یا فلسفۂ تاریخ کے تصور سے مختلف ہے۔

فلسفۂ تاریخ کا عام تصور تو یہ ہے کہ تاریخ پڑھ کر اس سے اُن اصولوں کا استنباط کیا جائے جن سے تاریخ کی حرکت وقوع پذیر ہوتی ہے۔ چنانچہ اُس سے ہوتا یہ ہے کہ اگر کسی زمانے میں اور اکثر زمانوں میں انسانی تاریخ کے mechanics میں کوئی خرابی ہے‘ تو اصول سازی کے اس عمل کے نتیجے میں وہ خرابی اصول میں بھی آ جاتی ہے۔ کیونکہ امرِ واقعہ یہ ہے کہ تاریخ نے اُس وقت حرکت اس طرح کی اور اُس سے فلسفۂ تاریخ کے ماہر نے یہ نتیجہ نکالا کہ تاریخ یوں ہی حرکت کیا کرتی ہے۔ لیکن جب اصول کا تعین آپ نے قرآن سے کیا اور اُس کا انطباق آپ نے تاریخ پر کیا تو تاریخ کی حرکت سند نہیں ہے خدا کا کلام سند ہے۔ یہ ایک اپروچ کا فرق ہے۔ تصورِ تاریخ یا تاریخی تجزیے کی جو منطق استعمال کی جارہی ہے اس میں غالباً پہلی مرتبہ یہ ایک چیز آئی ہے اور آج جہاں ہم یہ کہتے کہ اس ملک میں بحران اور کنفیوژن صحافیوں نے پیدا کیا‘ سیاست دانوں نے پیدا کیا‘ مزدوروں نے پیدا کیا یا علماء نے پیدا کیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ سب سے بڑا کنفیوژن (confusion) اس امر سے پیدا ہوا کہ پاکستان تخلیق ہوا‘ تاریخ کی اُن قوتوں کے ذریعے جو اوپر سے متعیّن ہوتی ہیں اور اس کی تعبیر کی گئی اُن قوتوں کے ذریعے جو ادنیٰ درجے سے پیدا ہوئیں۔ چنانچہ اس کی وجہ سے حضرت سلیمان اور داؤد علیہما السلام کا قصہ یاد آتا ہے کہ دو عورتیں ایک بچے کو لے کر پہنچیں‘ معروف قصہ ہے۔ اسی طرح محسوس ہوتا ہے کہ تاریخ کے ایوان میں آج دین اور ریاست اپنے بچے کو یعنی فرد کو لے کر پہنچی ہوئی ہیں۔ اصل ماں اُس کی دین ہے جس کا جی نہیں چاہتا کہ اسے دو ٹکڑے کر دیا جائے‘ جبکہ ریاست اس بات پر مصر ہے کہ یہ بچہ اُس کا ہے اور اگر آدھا بھی اُسے مل جائے تو کافی ہے۔ اس کے پیچھے درحقیقت اُلجھن یہ ہے کہ جو سمجھ میں نہیں آتی کہ اصل کنفیوژن ذہنوں میں تصورِ انسان کے بارے میں ہے۔ اگر آپ کا تصورِ انسان یہ ہے کہ انسان ایک سماجی حیوان ہے تو آپ اس کے علاوہ کسی اور نتیجے پر پہنچ ہی نہیں سکتے کہ مغربی طرزِ جمہوریت کے علاوہ پاکستان کو چلایا جاسکتا ہے۔ اگر آپ کا تصور یہ ہے کہ انسان ایک معاشی حیوان ہے تو اشیاء اور خیالات کی منطق آپ



کو اس کے علاوہ کسی نتیجے پر پہنچنے نہیں دے گی کہ پاکستان کا مستقبل مارکسزم ہے۔ لیکن اگر آپ کا تصور یہ ہے کہ انسان اشرف المخلوقات اور خلیفۃ اللہ فی الارض ہے تو آپ کے ذہن کی منطق اور آپ کا پورا استدلال آپ کو مجبور کر کے یہاں لے جائے گا کہ اس مملکت کا مقصود اور اس کی بنیاد‘ اس کا root اور اس کا crown دونوں غیر مذہبی کسی طرح نہیں ہوسکتے‘ اس لیے کہ دین آدھے پونے چوتھائی آدمی کا مطالبہ نہیں کرتا بلکہ:

*Absoluteness of Truth demands totality of Faith.*

تو یہ جو بحران ہے ہم یہ نہیں کہتے کہ پاکستان کے بارے میں یہ کسی ایسے تصور سے پیدا ہو رہا ہے جہاں فسادِ نیت میں ہے یا فہم میں ہے ع ’’سخن شناس نہ ای‘ دلبرا خطا ایں جا است!‘‘ اصل کنفیوژن پاکستان کے تشخّص کے بارے میں نہیں ہے اپنے قلب کے تصور کے بارے میں ہے۔ اگر یہ قلب سوائے اللہ کے اور اُس کے رسول کے کسی کے لیے نہیں ہے تو معلوم یہ ہوگا کہ دنیا میں جو چیزیں عزیز ہیں وہ اُسی واسطے سے اور اُسی تعلق سے عزیز ہیں۔ یہ کوئی جذباتی بات نہیں ہے بلکہ اشیاء کی منطق اور انسانی فکر و خیال اور جذبات کا جو باہم تانا بانا (co-ordination) ہے اس کی بنیادی منطق ہے۔ کتاب کے فلیپ پر ڈاکٹر صاحب نے بہت اچھی بات یہ کی ہے کہ یہ فرق قائم کر دیا ہے کہ اس کتاب کے مخاطبین کون لوگ ہیں! اس لیے کہ جہاں قصورِ فہم میں ہو اُس کو دور کیا جاسکتا ہے‘ جہاں فتورِ ارادے میں ہو‘ ارادے کے اس فالج کو کسی اجتماعی تحریک کی حدّت سے شاید دور کیا جاسکتا ہے۔ لیکن جہاں قصور اور فتور نیت میں ہو‘ جس عمارت کی بنیاد میں سنگِ فتور رکھا جائے اور پھر اُس کی تقویت کے لیے پوری دنیا کی قوتیں پاکستان کے باہر اور اُن کی لابیاں پاکستان کے اندر اس فسادِ نیت کے خارجی نتائج کی منتظر ہوں اور اُسے پروان چڑھانے کے لیے تیار ہوں اُن سے کوئی مکالمہ نہیں ہوسکتا۔ اگرچہ یہ قرآن کا ناطق فیصلہ ہے لیکن بعض اوقات مغربی حلقوں سے مکالمے کے دوران آدابِ محفل (social courtesy) اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ ہم ذرا کھل کر اُن سے گفتگو کر سکیں کہ تاریخ کا عمل جب چلتا ہے اور تاریخ کے گھوڑے کی لگامیں ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل ہوتی ہیں تو اُس کا معاملہ کیا ہوتا ہے۔ ابھی ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے کہ بعض ذرائع ایسے ہوتے ہیں کہ جنہیں کسی نظام کو بہتر طور پر چلانے کے لیے اور اُس نظام میں بہتر نتائج پیدا کرنے کے لیے تو برتا جاسکتا ہے‘ لیکن اس نظام کو تبدیل کرنے کے لیے ان کو استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ مسئلہ یہی ہے کہ خود یہاں تک ہم ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے تک اور ایک دور سے دوسرے دور میں آئے

ہیں۔اسلام کی تاریخ کے بارے میں ہمارا چاہے جو بھی فیصلہ ہو‘لیکن ہندوستان میں عہد آخر تک جو تسلسل تھا وہ اسی اقتدار کا تسلسل تھا جس کا آغاز مدینہ منورہ سے ہوا تھا اور استعمار کے آنے کے بعد اس نئی مملکت کی تخلیق جب ہوئی تو کیا اس تسلسل اقتدار کے ٹوٹنے اور اس کے دوبارہ قائم ہونے کے درمیان کوئی تبدیلی نہیں آئی؟ عالمی سطح پر وہ کون سے نئے تقاضے پیدا ہوئے ہیں جو اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ نظام کے تمام درجات کو‘نظام کی تمام سطحوں کو‘غور سے دیکھا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ اقتدار کی کیمسٹری پچھلے عرصے میں کیا رہی ہے اور اقتدار کی کیمسٹری موجودہ Geo-Political Situation (علاقائی سیاسی صورت حال) میں کیا ہے۔درحقیقت جب ہم کہتے یہ ہیں کہ اقتدار چھن گیا تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ تاریخ کی قوتوں کو متعیّن کرنے اور تاریخ کو اپنے قلب اور ایمان کے متعین کردہ راستے پر لے جانے کے جو طریقے تھے وہ طریقے بدل گئے ہیں۔اقتدار چھن جانے سے مراد صرف یہ نہیں ہے کہ جو باج گزاری ہوتی تھی اور جو خراج ملتا تھا وہ خراج ملنا بند ہو گیا ہے‘بلکہ دنیا کی عالمی (global) سیاست میں اسلام جس طرح تاریخ کی قوتوں کے رخ متعین کرتا تھا اُس طرح تاریخ کی قوتوں کے رُخ متعیّن کرنے کے جو ذرائع تھے وہ ہمارے ہاتھ سے جاتے رہے‘اور پاکستان کی تخلیق اس امکان کی تخلیق تھی کہ دوبارہ اُسی طرح تاریخ کے گھوڑے کی لگامیں اور راسیں شاید مسلمانوں کے ہاتھ میں آجائیں۔لیکن ؎

وہاں دیوار اُٹھا دی مرے معماروں نے
گھر کے نقشے میں مقرّر تھا جہاں در ہو گا

یعنی جو ابتدائے کار تھا اُسے ٹیڑھا کر دیا۔ڈاکٹر صاحب نے جو تجزیہ کیا ہے اس کی روشنی میں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آئندہ جس کتاب کا یہ وعدہ کر رہے ہیں اور جس کا حوالہ اس کتاب میں بھی موجود ہے وہ کیا شے ہے! اور کیا کیا کنفیوژن اس ملک میں پیدا ہوئے اس مسئلہ پر۔قابل توجہ بات یہ ہے کہ کیا اصل مقصود یہ ہے کہ دنیا میں انسانوں کے تخلیق کیے ہوئے نظاموں کے برابر لاکر اُلوہی پیغام کو کھڑا کر دیا جائے یا اصل مقصود یہ ہے کہ جناب آدم علیہ السلام کی آمد سے لے کر آج تک دنیا کی تاریخ خدا کے متعیّن کردہ جس راستے پر چلی جا رہی ہے اُس راستے پر ہمارا جو رول ایک مملکت کی حیثیت سے اور ایک اجتماع کی حیثیت سے بنتا ہے ہم اس رول کو ادا کریں۔اور کیا یہ نہیں ہوا کہ اس مملکت میں نظام اور فقہ کی اصطلاح کے تحت ایک التباس پیدا ہوا۔ہم یہ نہیں کہتے کہ بدنیتی سے پیدا ہوا‘لیکن تاریخ کی حقیقت اپنی جگہ موجود ہے کہ یہ



التباس جو پیدا ہوا یہ نقصان دہ ہے۔جس وقت ضرورت یہ تھی کہ اُن قوتوں کی تشکیل کی جائے جو صورت حال کو متغیّر کر سکیں‘ظاہر میں بھی اور باطن میں بھی‘اور اسلام کا اس مملکت کے حوالے سے ایک بین الاقوامی رول متعیّن کر سکیں‘اس وقت کوشش یہ ہو رہی تھی کہ فروعات اور جزئیات کا کوئی فیصلہ ہو جائے۔جب ایک مرتبہ آپ نے اس domain میں یعنی اس دنیا میں قدم رکھ دیا جو ظاہر میں پھیلتی ہوئی diversity اور ہزارہا اختلافات کی دنیا ہے تو اس کا نتیجہ سوائے کنفیوژن کے کچھ نہیں ہو سکتا۔اُس کی اپنی ایک ضرورت ہے‘لیکن اس کا اپنا ایک وقت ہے‘تو نتیجہ کیا ہوا کہ تخلیقِ مملکت کے بعد پہلی کوشش جو تھی تخلیقِ قدر کی..... یہاں میں آپ سے عرض کر دوں کہ جب ہم تخلیقِ قدر کہتے ہیں تو اُس سے مراد یہ نہیں ہوتی کہ عدمِ محض سے قدر کو تخلیق کرنا ہے‘بلکہ انسانی صورت حال میں انسانی اجتماع میں جو قدریں گمراہیوں کی وجہ سے متروک ہوتی جا رہی ہیں —— اس لیے کہ قدر تو خیر مطلق کی انسانی extention ہے —— اور ارادہ ساکت ہوتا جا رہا ہے‘ان دونوں کے ربط کو درست کیا جائے‘لیکن قانون کے ذریعے تخلیقِ قدر نہیں ہو سکتی‘ہاں تحفظِ قدر ہو سکتی ہے۔پاکستان پینل کوڈ کے ذریعے تحفظِ پاکستان ہو سکتا ہے تخلیقِ پاکستان نہیں ہو سکتی۔یہ ایک بنیادی کنفیوژن تھا جس نے قانون کو آئیڈیل سے ہم آہنگ کر دیا‘ قانون اور آئیڈیل کو یک معنی کر دیا۔چنانچہ ہم چلتے تھے پایاب پانی میں اور رخ کرتے تھے سمندر کا۔نتیجہ اُس کا یہ ہوتا تھا کہ عزائم اور نعرے بلند اور حاصل کم۔اس چیز نے ایمان اور یقین کا دیوالہ نکال دیا کہ دعوے تو حق کی کامیابی کے ہیں اور مشاہدے باطل کی کامرانی کے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ آپ کا وہ تصورِ تاریخ جو خارج میں نتائج پیدا نہیں کر سکتا‘عین ممکن ہے کہ پختہ ایمان کے لوگوں میں ان کے ایمان بالغیب کو disturb نہ کرے‘لیکن یہ تو ممکن ہے کہ اُن کے یقین کا جنازہ نکال دے‘کیونکہ یقین کا مدار اور یقین کی بنیاد تجرباتی مشاہدات یعنی empirical fact اور empirical verification پر ہے۔اگر ہم یہ کہیں تو ہم سے بڑا احسان فراموش کوئی نہیں ہوگا کہ اس ملک کے عوام اسلام سے زندہ دلچسپی نہیں رکھتے۔ روزانہ اس بات کے مشاہدے ہوتے ہیں‘الحمد للہ جو کیفیت قلب ہے‘اور نبی کریم ﷺ نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے بارے میں بھی تو یہی فرمایا تھا کہ ’’ولکن شیءٌ فی القلب‘‘ کہ ان کے دل میں کوئی چیز ہے۔تو جو اجتماعی کیفیتِ قلب ہے اس کے بارے میں الحمد للہ دلوں کو اطمینان ہے اور ذہنوں کو یہ اندازہ ہے کہ وہ کیفیتِ قلب کتنی گہری ہے اور کتنی بڑی نعمت ہے۔ لیکن اس کے مظاہر خارجی کی تخلیق کرنے والی جو قوتیں رہیں بعض اوقات فتورِ نیت سے اور

بعض اوقات فتورِ فہم سے انہوں نے وہ راستے اختیار کیے جو اسلام کی آفاقیت سے مطابقت نہیں رکھتے تھے۔ ایک بات یاد رکھیے کہ دنیا کے کسی کونے میں ایک آدمی بھی جب اسلام کا اصل موقف اختیار کرے گا تو اس کا مقابلہ اور معارضہ صرف وہاں کی قوتیں نہیں کریں گی' بلکہ چونکہ اسلام کے ہر اصول میں ایک آفاقیت کارفرما ہے' لہٰذا بدی کی آفاقی قوتیں اس کے مقابل صف آراء ہو جائیں گی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر آپ ایک موقف اختیار کریں اور وہ آپ کے محلے تک محدود رہ جائے تو وہ اسلامی نہیں ہوگا' کیونکہ اگر وہ موقف درست ہے' اسلامی ہے..... یعنی اگر وحی اُتری ہے تو ابوجہل کو تکلیف ہونی ضروری ہے' اگر تکلیف نہیں ہو رہی تو وحی نہیں اتری۔ تو صورتِ حال یہ ہے کہ یہ ممکن نہیں ہے کہ آپ ملک کا راستہ کوئی اور متعیّن کریں' معیشت کا راستہ کوئی اور متعین کریں' سیاست کسی اور رخ سے چلائیں اور خارجہ پالیسی کسی اور چیز کا اتباع کرتی ہو۔ اس وقت پاکستان کے استحکام سے بحث کرنے کا مطلب یہ ہے کہ پاکستان کی باطنی سالمیت اور اس کے خارجی وجود کا تحفظ کیا جائے جو کہ دنیا کی بڑی قوتوں کے درمیان گھرا ہوا ہے' لیکن اس کی صورت حال اس وقت الحمدللہ بہت اچھے امکانات سے پُر ہے۔ آج سے دس سال پہلے یہ اندازہ نہیں ہوتا تھا' لیکن اردگرد کی مسلمان اقلیتوں میں شعور کی جو لہریں پیدا ہو رہی ہیں ان سے صرفِ نظر کرنا اب ممکن نہیں ہے۔ پاکستان کے رول کو اس کے استحکام کو جب تک ان سے جوڑ کر نہیں دیکھا جائے گا اس کے معنی واضح نہیں ہوں گے' کیونکہ اگر اس کے معنی واضح ہوں گے تو ملت کے ایک حصے کی حیثیت سے ہوں گے۔ آپ کا کیا خیال ہے بعض لوگ کہتے ہیں کہ روس کی نظریں گرم پانیوں کے سمندر پر ہیں۔ یہ لوگ ذہنی طور پر اٹھارہویں صدی کے اواخر میں رہتے ہیں۔ انہیں معلوم نہیں ہے کہ آج کی دنیا کی ٹیکنالوجی میں گرم پانی اور ٹھنڈے پانی کے کوئی معنی نہیں رہ گئے ہیں' یہ سٹاروار کا زمانہ ہے۔ معاملہ صرف اتنا ہے کہ بزعم خویش روس ایک نظریاتی ملک ہے اور اُس کی آبادی میں مسلمانوں کی consolidated آبادی کا بہت بڑا حصہ موجود ہے ایک جگہ پر' اور ان کے درمیان ان کی نسل بھی مشترک ہے' ان کا کلچر بھی مشترک ہے اور دین بھی مشترک ہے۔ ایک نظریاتی مملکت کی حیثیت سے اُسے اس بات کا خوب اندازہ ہے کہ کسی دینی اور نظریاتی مملکت کا بالکل اس کے ساتھ واقع ہونا کتنے بڑے خطرے کی بات ہے۔ یہ تو بارودخانے کے برابر تنور لگانے والی بات ہے' چنگاری کا پتا نہیں ہوتا۔ ۱۹۲۰ء اور ۱۹۴۵ء والی چنگاری کا کسے پتا تھا۔ یہ جو آگ اندر جل رہی ہے' اس کا تعلق گرم پانیوں سے نہیں' اس کا تعلق کسی شعلے سے ہے' کیونکہ ؎



ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

دراصل جس تصورِ تاریخ کی بنیاد پر یہ ملک بنا اس کے سرچشمے اور اس کے source کے مطابق اگر ہم اپنا تصورِ تاریخ قائم نہیں کریں گے تو عقل شریف میں کچھ آئے گا' عمل شریف میں کچھ آئے گا۔ حقیقتِ معاملہ یہ ہے کہ پاکستان بنا تو تاریخ کی اس حرکت سے جس کا سرچشمہ قلب ہے۔ یہ جو لوگ آج استہزاء کے ساتھ کہتے ہیں کہ فلاں چیز محض ایک نعرہ تھی۔ نعرے کی حقیقت پر بھی تو غور کیجیے' کبھی ہونٹ سے نکلتا ہے' کبھی حلق سے نکلتا ہے' کبھی دل سے نکلتا ہے اور کبھی دل پھاڑ کر نکلتا ہے۔ تھا تو نعرہ' لیکن یہ آواز آ کہاں سے رہی تھی؟ یہ نعرہ ملت کا پھڑکتا ہوا دل تھا!

چنانچہ جب یہ ہوا کہ تصورِ تاریخ آپ نے کہیں سے لیا اور نتائجِ تاریخ کسی اور ذریعے سے برآمد کیے تو ان کے درمیان جو اختلاف پیدا ہوا اس اختلاف کا لازمی نتیجہ انتشار تھا' اور اس انتشار نے دو نتائج پیدا کیے۔ ایک نصب العین کی خیرگی۔ آج اگر پاکستان کا کوئی باطنی بحران ہے تو وہ یہ ہے کہ نصب العین خیرہ ہو گیا ہے۔ ملک کو محض بچا لینا نصب العین نہیں شرط ہے' جس طرح سانس لینا زندگی نہیں شرطِ زندگی ہے۔ ملک کو خارجی حملوں سے اور اندرونی سازشوں سے بچا لینا نصب العین نہیں ہے' نصب العین تو آفاقی ہوگا۔ نصب العین تو یہ ہوگا کہ پاکستان تو الحمدللہ مستحکم و مضبوط ہے' اب اس کا بین الاقوامی سیاست میں کیا رول ہو۔ پوری دنیا میں اسلام کی ایک مصلحتِ کُلّی ہے جو ایک بسیط حقیقت کے طور پر عمل (operate) کر رہی ہے' اس میں پاکستان کا کیا رول ہو۔ نصب العین کی بحث تو وہاں ہوگی۔ یہ تو ہم صرف شرط پر گفتگو کر رہے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ نصب العین خیرہ ہو گیا ہے۔

کسی آدمی سے آپ یہ پوچھئے کہ پاکستان اگر توانا' قوی' مضبوط اور مستحکم ہو جائے تو دنیا میں کیا کرے گا؟ اُس کے بیان کی اجازت مغربی طرزِ سیاست سے نہیں ملتی۔ اور اگر وہ منزل وہ مقصود سامنے نہ رکھا گیا تو اس ملک کا جواز ہی باقی نہیں رہتا۔ سلیم احمد نے ایک جگہ لکھا تھا کہ ہمارا جمہوریت سے معاملہ مرحوم آقا کی صاحبزادی کا سا ہے کہ کبھی تو آقا سے وفاداری یاد آتی ہے تو اس کی خدمت میں لگ جاتے ہیں' کبھی بُعد محسوس ہوتا ہے تو ہٹ کر دور بیٹھ جاتے ہیں کہ اب آقا تو رہے نہیں اب اس کی کیا پاسداری کرنی۔ یہ خیرگی ہے' اور یہ خیرگی ایک باطنی ذہنی اجتماعی کیفیت کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہے۔ اس کیفیت کا بہت عمدہ تجزیہ ''استحکامِ پاکستان'' میں کیا گیا ہے اور جماعتوں کے اعتبار سے بڑے واضح اور نمایاں (significant) انداز میں

کیا گیا ہے۔ اگر نصب العین میں باطنی یعنی خیال کی سطح پر اور اجتماعی اُمنگ کی سطح پر خیر گی پیدا ہو جائے تو خارج میں تنظیم کی سطح پر بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ نتیجہ خیزی کا تعلق خیال سے نہیں ہے' نتیجہ خیزی کا تعلق محض عمل سے بھی نہیں ہے' نتیجہ خیزی کا تعلق صرف تنظیم سے ہے۔ بدی کی تنظیم پیدا کر دیجیے' بدی کے نتائج پیدا ہوں گے۔ تخلیقِ نتائج کا تعلق تنظیم سے ہے' خیر کی قوتوں کو منظّم کر دیجیے خیر کے نتائج پیدا ہوں گے۔ اس لیے جب باطن میں نصب العین کی خیر گی پیدا ہوئی اور ظاہر میں تنظیم میں بحران پیدا ہوا تو نتیجہ خیزی بند ہو گئی اور سمت سفر معدوم ہو گئی۔ پاکستان کی تاریخ کو اب ہم ذرا اس نقطۂ نظر سے دیکھیں گے۔ اس خیر گی کی کارفرمائی کا اثر یہ ہوا کہ ملک میں group contradiction پیدا ہو گیا۔

آپ خود غور کیجیے کہ قرآن کے بالکل آغاز ہی میں اللہ تعالیٰ یہ بات واضح فرما دیتے ہیں کہ انسانوں میں سے کچھ مؤمنین ہوتے ہیں' کچھ منافقین اور کچھ کفار ہوتے ہیں۔ معاملہ کیا ہے؟ یہ انسانی فطرت اور انسانی نفسیات کی بنیادی کلید ہے کہ جب ایک موقف اختیار کیا جائے گا تو اس کے تین ردعمل پیدا ہوں گے' جسے اسلام کی اصطلاح میں ایمان' کفر اور نفاق کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں کوشش یہ رہی کہ یہ گروپ الگ الگ متشخص (define) نہ ہونے پائیں' لہٰذا وہ چیز جسے سامنے آ کر تاریخ کی حرکت میں اپنی شکلیں اختیار کرتے ہوئے آگے بڑھنا چاہیے تھا اور اس کے ٹکراؤ سے نتائج پیدا ہونے چاہئیں تھے' وہ چیز قومی مزاج سے ساقط ہو گئی اور قرآنی اعتبار سے بعض اوقات اس واجب ٹکراؤ (confrontation) کو جب avoid کیا جائے گا تو اس کا اثر باطن میں اُتر جائے گا' اُمت کے باطن میں اتر جائے گا' فرد کے باطن میں اُتر جائے گا۔ فرد کے باطن میں اُترے گا تو نفاق پیدا ہو گا۔ اُمت کے باطن میں اترے گا تو فروعی اختلافات پیدا کرے گا اور اس سے شرک کی مختلف شکلیں پیدا ہوں گی۔ جو چیلنج سامنے ہے اس چیلنج کے مقابل ایک چیلنج ہے۔ اگر خدانخواستہ چیلنج پاکستان کے وجود کے لیے ہے تو ان قوتوں کے وجود کے لیے بھی پاکستان کی طرف سے ایک چیلنج ہو جن کی طرف سے یہ چیلنج پیدا ہو رہا ہے۔

جب تک چیلنج کے جواب میں چیلنج کا تناسب برابر نہیں ہو گا' حرکت نتیجہ خیز اور مقصود سے قریب تر کرنے والی نہیں ہو گی۔ تو یہ باتیں طے کرنی ہیں کہ وہ کون سا بنیادی تضاد ہے جس کی بنیاد پر اس ملک میں یا دنیا میں کہیں آپ کا موقف طے ہو گا —— اسلام کی بنیاد پر جو تضاد پیدا ہوتا ہے' چونکہ اسلام ایک بسیط حقیقت ہے اس لیے وہ چیلنج اور وہ تضاد بھی آفاقی ہوتا ہے —— تو



وہ کون سا بنیادی نقطہ ہے جو آپ کا موقف بنے گا' اس کی طرف اشارے موجود ہیں اور وعدہ ہے کہ اگلی کتاب میں اس کا ذکر ہو گا۔ وہ چیلنج اور وہ تضاد جب شدت اختیار کرتا ہے تو گروپ کی تنظیم کی نوعیت کیا ہو گی؟ کیونکہ ہمارے ہاں تنظیم کی نوعیت سے مراد سیاسی بھیڑیں پالنا سمجھا جاتا ہے۔ جس طرح موقف وجود کی کلیت چاہتا ہے اسی طرح تنظیم وجود کی کلیت چاہتی ہے۔ یہ نہیں ہو گا کہ آپ کا ایک چوتھائی مفاد دوسرے کے ایک بٹا آٹھ (۱/۸) مفاد سے وابستہ ہو جائے تو یہ گروپ کی تنظیم ہو گی۔ زندگی اور موت کے سارے وسائل جب وابستہ ہوں گے تو تنظیم ہو گی۔ مواخات کا فیصلہ' آپ کا کیا خیال ہے کہ کسی وقتی رقت قلب سے پیدا ہوا تھا؟ انسانی فطرت سے پیدا ہوا تھا کہ تمہارا مذہبی موقف ایک ہے' تمہاری سیاسی حیثیت ایک ہے' تمہاری مملکت میں زندگی اور موت ایک ہے' تو آؤ جو چیزیں تمہارے درمیان مشترک ہو سکتی ہیں وہ بھی مشترک ہو جائیں۔ یہ تھا پہلا پتھر پہلی اینٹ تنظیمی اصول کی۔ یہ تفصیلی مسائل ہیں ان پر گفتگو ہو سکتی ہے' لیکن خوشی اس بات کی ہے کہ آج پاکستان کی تاریخ کو ایک نئی سطح سے دیکھا جا رہا ہے۔ میں نے پاکستان کی تاریخ کے بارے میں یا مسلمانوں کی تاریخ کے بارے میں کچھ چیزیں دیکھی ہیں' ان کے نیچے حاشیوں کی بھرمار بھی دیکھی ہے۔ ابن خلدون سے لے کر ٹائن بی تک حوالے ہیں' لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ مقصود ہمارا زوال کی توجیہہ کرنا نہیں۔ ابن خلدون سے لے کر ٹائن بی تک دنیا کے تمام فلسفیان تاریخ زوال کی توجیہہ کرتے ہیں' زوال سے نکلنے کا راستہ کوئی نہیں بتاتا۔ یہ بالکل ایک اصول ہے۔ یہ تو بتا دیں گے کہ زوال کیوں ہوا۔ ابن خلدون نے بتایا کہ جب عصبیت زائل ہو جائے تو قوم میں زوال آ جاتا ہے' لیکن عصبیت دوبارہ پیدا کرنے کی کیا شکل ہو گی' ابن خلدون اس پر خاموش رہے۔ ٹائن بی نے بتایا کہ اگر معاشرے میں response پیدا ہونا ختم ہو جائے تو زوال پیدا ہو جاتا ہے' تو اُن سے پوچھا جائے کہ response کیسے پیدا ہوتا ہے تو اس کا اُن کے پاس کوئی جواب نہیں۔ دنیا میں صرف ایک کتاب ایسی ہے جو زوال کی توجیہہ ہی نہیں کرتی' زوال سے نکلنے کا راستہ بھی بتاتی ہے اور وہ کتاب ہے قرآن کریم' اور اُسی کے سائے میں ہم آج بھی زوال سے نکلنے کا راستہ ڈھونڈ سکتے ہیں۔ ورنہ ہمارے زوال کی توجیہہ پر تو مغرب کی کئی یونیورسٹیاں پل رہی ہیں۔

❁❁❁

# تحریکوں میں جلد بازی کی ذہنیت

سید قطب شہیدؒ

(اس مضمون میں انتخابی سیاست میں حصّہ لینے کے حوالے سے اگرچہ مخالفانہ موقف میں شدّت موجود ہے‘ لیکن پھر بھی اس میں تحریکی کارکنان کے لیے غور و فکر کا مؤثر مواد موجود ہے۔)

ایک بات جلد بازی کا شکار ہو جانے والوں سے اکثر سننے کو ملتی ہے: تربیت بہت ہو چکی‘ اب کچھ کرنے کا وقت ہے۔ یہ جملہ کہ ’’تربیت بہت ہو چکی‘ اب کچھ کرنے کا وقت ہے!‘‘ مختصر ہونے کے باوجود دو انتہائی خطرناک قضیوں پر مشتمل ہے‘ جن کا تعلق اسلام کے تحریکی اور دعوتی عمل سے ہے۔ یہ دونوں قضیے شدید طور پر وضاحت طلب ہیں:

## پہلا قضیہ:

کیا واقعتاً تربیت بہت ہو چکی ہے؟ اور وہ کون سا معیار ہے جس سے ہم یہ معلوم کر لیتے ہیں کہ تربیت جتنی ہونی چاہیے تھی وہ اب تک ہو چکی ہے یا ابھی مزید تربیت کی ضرورت ہے؟

## دوسرا قضیہ:

کچھ کرنے سے ہمارے جلد باز لوگوں کی کیا مراد ہے؟

میں دوسرے قضیے سے ہی بات شروع کروں گا‘ کیونکہ اس کا واضح ہونا پہلے قضیے سے آسان تر ہے‘ اور اس لیے بھی کہ یہ کہنے والوں کے ذہن میں ایک متعیّن قضیہ ہے۔ جہاں تک پہلے قضیے (تربیت) کی بات ہے تو شاید وہ ان کے ذہن میں ابھی تک کوئی متعیّن شکل نہیں رکھتا۔

بنیادی طور پر یہاں دو قسم کے اندازِ فکر پائے جاتے ہیں‘ جن کی بنیاد پر دو قسم کے کام ہیں جو جلد بازی کا شکار ہو جانے والوں کے ذہن میں آتے ہیں۔ ایک اندازِ فکر نوجوانوں کا ہے اور دوسرا بزرگ اور عمر رسیدہ حضرات کا۔ جہاں تک نوجوانوں کا تعلق ہے جو کہ جذبات سے بھرے



ہوتے ہیں اور خود کو جلد بازی پر مجبور پاتے ہیں تو ان کی سوچ اس بات کے گرد گھومتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح طاقت کا استعمال کر کے اقتدار تک پہنچا جائے اور قوم کی تربیت کا کام اقتدار سے مدد لے کر کیا جائے‘ نہ کہ دعوتی عمل کے ذریعے سے۔ دعوت کی راہ سے قوم کی تربیت ایک بے انتہا دشوار کام ہے اور اس کے لیے بے انتہا وقت درکار ہے۔ خصوصاً اس صورتِ حال میں کہ دشمن راستے میں ہر جگہ گھات لگائے بیٹھے ہیں‘ اسلامی تحریک کے لیے یہاں جگہ جگہ رکاوٹیں کھڑی کی جاتی ہیں‘ اور جب بھی یہ اکٹھی ہونا چاہتی ہے تو دشمن قوتیں اسے تتر بتر کر کے رکھ دیتی ہیں۔

جہاں تک بزرگ اور عمر رسیدہ اصحاب ہیں‘ جو کہ ایک طویل سفر طے کر آتے ہیں اور اس راہ میں پے در پے بہت ضربیں سہہ آتے ہیں‘ ان کی سوچ کا محور ایک ایسی پُرامن دعوت ہے جو اربابِ اختیار کے ساتھ کبھی بھی اور کسی بھی صورت میں نہ الجھتی ہو اور جس کی کوئی نہ کوئی ذیلی شاخ پارلیمان اور انتخابات کا راستہ اپنا کر رکھے اور یہاں کی سیاست پر اسی کے اندر سے اثر انداز ہونے کی کوشش کرے۔ یا کم از کم یہ کہ یہاں کے سیاسی اداروں کے اندر جا کر اسلام کی بات کرے‘ کیونکہ یہی ادارے اس وقت لوگوں کی زندگی پر اصل تاثیر رکھتے ہیں اور یہیں پر اٹھائی ہوئی آواز ان کے خیال میں لوگوں کو محسوس ہو سکتی ہے۔

سب سے پہلے تو ہم ان دونوں فریقوں کی بابت یہ گمان رکھیں گے کہ ان میں مکمل اخلاص پایا جاتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ صرف اخلاص کافی نہیں ہوتا‘ اس کے ساتھ بصیرت ناگزیر ہے۔ بصیرت کی شرط پوری نہ ہو تو اخلاص کے شجر پر پھل نہیں آیا کرتا۔

ہم اس سے پہلے جو بات کر چکے ہیں اس کو یہاں پھر دہراتے ہیں۔ یہاں پر اگر کسی اسلامی قوت کو اقتدار مل جاتا ہے تو ظاہر ہے کہ اسے باہر سے کسی دشمن اسلام سے مدد ملنے کی توقع نہیں رکھنی چاہیے‘ نہ روس کا سہارا نہ امریکہ کا‘ نہ کسی صلیبی طاقت کا اور نہ صیہونیت کا۔ کفر کے پورے بلاک سے ظاہر ہے کہ اس اسلامی اقتدار کی کہیں سے کوئی ایسی پشت پناہی نہ ہو گی جیسا کہ ہمارے دیکھنے میں آج تک ایسے ہر انقلاب کو میسّر آ جاتی رہی ہے جو کسی اشتراکی یا قومی مقصد کے لیے کسی ملک میں برپا کیا گیا اور جس سے لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ اگر اور انقلاب کامیاب ہو جاتے رہے اور ان کی کہیں سے پشت پناہی ہو جاتی رہی تو پھر اسلامی انقلاب بھی اسی طرح کیوں کامیاب نہیں ہو سکتا! سو یہ بات طے ہے کہ اس مسلم اقتدار کو معاشرہ کے اندر سے ہی سہارا چاہیے ہو گا‘ مگر یہ سہارا یہاں کہاں ہے؟ کیا یہاں وہ مضبوط

ایمانی جتھہ ہے جو معاشرے پر پوری طرح اثر انداز ہوسکتا ہو اور اسلام کے اقتدار کو پہلے قائم کرنے اور پھر قائم رکھنے کے لیے اتنے مضبوط سہارے کا معاشرے کے اندر سے ہی انتظام کرسکتا ہو' جس کے بغیر آج کے حالات میں اسلامی اقتدار کا وجود ممکن نہیں؟

چلیں ہم کچھ دیر کے لیے فرض کر لیتے ہیں کہ عالم اسلام کے کسی خطے میں جذباتی نوجوانوں کا کوئی گروہ ایسا کامیاب منصوبہ بنالیتا ہے اور اس کی بنا پر انقلاب بھی لے آتا ہے اور اسلامی حکومت بھی قائم کر دیتا ہے [یہ کتاب طالبان کے تجربے سے کوئی دس بارہ سال پہلے شائع ہوئی ہے۔ افغانستان میں جو ہوا وہ مصنف کی دور اندیشی کی دلیل سمجھی جانی چاہیے۔ (مترجم)] سوال یہ ہے کہ اس انقلاب کو سہارا کہاں سے ملے گا؟ بطور مثال مصر ہی کو لے لیں۔ ہم اس کتاب میں مصر کے اسلامی تجربہ پر اس سے پہلے بھی بات کر چکے ہیں۔ اس وقت پورے عالم اسلام میں سب سے مضبوط اسلامی تحریک بلاشبہ مصر ہی میں پائی جاتی ہے' مگر کیا یہ تحریک بھی اپنی موجودہ حالت میں اسلامی اقتدار کو معاشرے کے اندر سے وہ مطلوبہ سہارا فراہم کرسکتی ہے اور کسی متوقع صلیبی' صیہونی جارحیت سے دفاع کرنے میں ہر قسم کے حالات سے نبرد آزما ہوسکتی ہے؟ حتیٰ کہ ہم یہ بھی فرض کر لیتے ہیں کہ امریکہ براہِ راست کوئی حملہ کرنے نہیں آتا جس کی امریکی عزائم سے زیادہ توقع رکھنی چاہیے اور امریکہ اسرائیل کو بھی اس پر حملہ کرنے کے لیے نہیں اکساتا جس کا ہمیشہ اور ہر وقت ہی امکان ہے۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہوتا' بس صرف مصر کو گندم کی سپلائی بند ہو جاتی ہے!

مصر کی موجودہ حالت کو دیکھتے ہوئے کیا خیال ہے کہ مصری قوم اسلام کے اقتدار کے قائم رہنے کی خاطر آخری لمحے تک بھوک برداشت کرنے پر تیار ہو جائے گی؟ یا آپ کے خیال میں کچھ ہی دنوں بعد مظاہرے ہونے لگیں گے؟ اشتراکیت پسند' سیکولر اور لادین لوگ جب سڑکوں پر آئیں گے تو ان کے پیچھے بھوک کے مارے عوام بھی روٹی اور آزادی کے نعرے لگاتے نکل آئیں گے؟

حقیقت پسندی کے بغیر چارہ نہیں۔ یہ مانے بغیر مفر نہیں کہ ایسی کوئی معاشرتی بنیاد ابھی موجود ہی نہیں جو اتنے مطلوبہ حجم کو پہنچ چکی ہو۔ جب تک معاشرے پر براہِ راست اثر انداز ہونے کا اتنا کافی انتظام نہیں کر لیا جاتا تب تک حصولِ اقتدار کے لیے کسی حکومت وغیرہ سے الجھنے کی کوئی بھی کوشش نری بے سود اور عبث ہے نہ کہ بصیرت اور دانشمندی کا تقاضا۔ اس کی ایک واضح ترین مثال حمات کا واقعہ ہے (حمات شام کا ایک شہر ہے جس میں اسلام پسند نوجوانوں



نے حافظ الاسد کے خلاف ہتھیار اٹھانے کی کوشش کی تو پورے شہر کو بلڈوزروں سے ملیامیٹ کر دیا گیا۔ ہمارے ہاں بھی مالاکنڈ ایجنسی میں خاصی چھوٹی سطح پر یہی کچھ ہوا' خاصی چھوٹی سطح سے مراد ہے کہ شام کے شہر حمات کی نسبت جو کہ قریب قریب کھنڈر بنا دیا گیا تھا۔ مترجم) یہ ایک ایسا نمونہ ہے جو کسی اسلامی تحریک کے غور و فکر کے لیے بہت کچھ اپنے اندر رکھتا ہے۔ اس کے مضمرات کا اندازہ کرنا نہایت ضروری ہے تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ ہم اس وقت کہاں کھڑے ہیں اور ہمیں کس بے رحم دشمن سے پالا پڑا ہے۔ ایسا واقعہ کبھی بھی کسی بھی قیمت پر دہرایا نہیں جانے دینا چاہیے۔

اب اگر ہمارے جلد باز نوجوان یہ پوچھتے ہیں کہ یہ جس معاشرتی بنیاد کی آپ بات کرتے ہیں اور معاشرے پر براہِ راست اور بغیر اقتدار کے حاصل ہو سکنے والے گروہ کی ضرورت بیان کرتے ہیں' جب تک اس کی تعمیر نہیں ہوتی تب تک کیا ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں؟ تب تک کچھ کیا ہی نہ جائے؟ تو ہمارا جواب ہوگا کہ یہ معاشرتی بنیاد' کوئی شک نہیں کہ آہستہ آہستہ ہی وجود میں آئے گی' لیکن ایک بار اس کی بنیاد پڑ جائے اور اس پر کام ہونے لگے تو یہ وسعت اختیار کرنے میں کچھ ایسی سست رو بھی نہ ہوگی۔ اس کی نشوونما ہونے لگے تو اس کو روکا نہیں جا سکتا۔ اس میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ خود بخود نوجوان آ آ کر شامل ہوتے رہیں گے' جن کو پہلے سے راستے کی مشکلات کا اندازہ ہوگا اور وہ راستے کی اذیت ناکیوں حتیٰ کہ موت تک کے لیے تیار ہو کر اس سے آ ملتے رہیں گے۔ ان کو یہ بھی بخوبی اندازہ ہوگا کہ یہ ایک طویل سفر ہے۔ پھر اس قافلے کی زندگی میں ایک دن ایسا آ جائے گا جس کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں۔

جب یہ معاشرتی بنیاد مطلوبہ حد تک پختہ بھی ہو چکی ہوگی اور وسیع بھی' جب اس ایمانی جتھے کو کسی کے لیے مشن سے ہٹانا ممکن رہے گا اور نہ جھکانا' یہ عین وہ وقت ہوگا جب اللہ کی ایک طبعی سنّت کے تحت معاشرے میں لوگ فوج در فوج اس جتھے میں شامل ہونے لگیں گے۔ تب دشمن اپنے آپ کو ایک ایسی صورتحال میں پائے گا جہاں اس کے سامنے تنہائی کا شکار کوئی محض ایک دینی جماعت نہیں' ایک پوری قوم ہوگی جو یک آواز ہو کر وہی شہادت دے رہی ہوگی اور وہی صدا بلند کر رہی ہوگی جو یہ ایمانی جتھہ اس سے پہلے بلند کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ تب کوئی ایک جماعت نہیں پوری قوم اس دعوت کے پیچھے کھڑی ہوگی۔ جب کوئی دعوت اتنا کچھ کر چکی ہوگی تب اللہ کی وہ مشیت بھی حرکت میں آئے گی کہ جس سے دنیا اللہ کی سُنّتوں اور اس کے طبعی

قوانین کو عمل پذیر ہوتا دیکھ سکے اور یہی دن مؤمنوں کی خوشی کا دن ہوگا۔

یہ کہنا کہ اس معاشرتی بنیاد کے بننے تک نوجوان کیا فارغ بیٹھے رہیں اور کچھ نہ کریں؟ تو یہ بات اس لیے کہہ دی جاتی ہے کہ ایسا کہنے والوں کے ذہن میں کچھ کرنے کا ایک خاص معنی اور تصور ہے اور یہی تصور نوجوانوں کی دلچسپیوں کا محور بنا دیا گیا ہے۔ چنانچہ کچھ کرنے کے لفظ سے ان کے ذہن میں سوائے ہتھیار اٹھانے اور دشمن سے دو دو ہاتھ کرنے کے کچھ نہیں آتا۔ اس کے سوا ہر چیز ان کے خیال میں فارغ بیٹھ رہنے اور کچھ نہ کرنے کے مترادف ہے۔

ہم ان سے پوچھنا چاہیں گے کہ آخر یہ معاشرتی بنیاد یہی نوجوان نہیں تو پھر کون اٹھائے گا؟ یہ نوجوان اگر اُمت کی تعمیر کے عمل میں اپنی تمام تر صلاحیتیں کھپا رہے ہوں تو یہ فارغ کیسے سمجھ لیے جائیں گے؟ ایسے نوجوانوں کے بارے میں یہ تاثر کیونکر ذہن میں آتا ہے کہ وہ کچھ نہیں کر رہے؟ جلد باز نوجوانوں کے منہ سے یہ بات اس لیے نکل آتی ہے کہ ایک تو ان کو اس بات کا اندازہ ہی نہیں کرایا گیا کہ تربیتی عمل کی وسعتوں اور غایتوں کی حد کیا ہے اور پھر دوسرا اس لیے کہ تربیتی عمل کی غایت نہ جاننے کی وجہ سے وہ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ تربیت کا کام کر لیا گیا ہے اور اب یہ ضروری ہو گیا ہے کہ اس سے اگلے مرحلے کو منتقل ہوا جائے جو کہ ہتھیار اٹھانا اور دشمن سے برسرِ پیکار ہونا ہے۔

جہاں تک دوسرے فریق، یعنی بزرگ حضرات کے منہج کا تعلق ہے تو ایک بات ہمارے ذہن میں رہنی چاہیے کہ ہمارے یہ بزرگ حضرات بھی اسی مرحلے سے گزر کر آئے ہیں جس سے اس وقت کے نوجوان گزر رہے ہیں ۔ گویا یہ گزشتہ کل کے نوجوان ہیں جو آج کے نوجوانوں کی طرح اپنے دور میں یہی سمجھا کرتے تھے کہ بس ایک ضرب یا پے در پے چند ضَربوں کی ضرورت ہے کہ سب طاغوت گھٹنے ٹیک دیں گے اور اسلام کی حکمرانی ہو جائے گی! بہت سے نوجوان تھے جو درمیان میں کہیں جھڑ گئے مگر ہمارے یہ بزرگ حضرات دراصل گزشتہ کل کے وہ نوجوان ہیں جو ابھی تک چل رہے ہیں اور درمیان میں کہیں ہٹ کر بیٹھ جانا ان کو گوارا نہیں تھا۔ یہ لوگ پیچھے نہیں ہٹے، البتہ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ صرف دعوت دیتے چلے جانے کا راستہ بند ہو چکا ہے، سو اب راستے کو ذرا بدلنے اور آسان کرنے کی ضرورت ہے۔

اپنے طور پر ان کا اس انداز سے سوچنے کا ایک حد تک جواز بھی بنتا ہے۔ جوانی کے دور میں ان کو یہی سکھایا جاتا رہا تھا کہ باطل کو ہٹانے کے لیے بس ایک ضرب یا چند ضربیں لگانے کی ضرورت ہے، اس کے بعد دشمن شکست کھا کر میدان چھوڑ جائے گا اور اسلام کی جیت ہو جائے



گی، بس چند سال کی بات ہے۔ مگر عملاً یہ ہوا کہ یکے بعد دیگرے جو ضرب لگی انہی کو لگتی رہی۔ ہر بار دشمن ہی میدان جیت کر جاتے رہے۔ ان کا کام یہاں ایک کے بعد ایک ہزیمت اٹھانا رہ گیا ہے اور قریب قریب راستہ ملنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ چنانچہ ان کے خیال میں کسی ایسے راستے کی تلاش ہونی چاہیے جو مسدود نہ ہو۔ اب جو راستہ ان کے خیال میں بند نہیں ہے، جس کی جانب ہم ماقبل اشارہ کر آئے ہیں، وہ ہے پارلیمنٹ اور انتخابات میں شمولیت کا راستہ اور ایوانوں کے اندر سے اسلام کی آواز اٹھانے کا منہج۔ کیونکہ اسلام کی بات سنی جانے کا اور کوئی راستہ نہیں رہ گیا۔

اب جس طرح ماقبل ہم جلد باز نوجوانوں سے ان کے اس منہج پر گفتگو کر آئے ہیں جو ہتھیار اٹھانے اور دشمن کے ساتھ جنگ کرنے پر یقین رکھتے ہیں اور اس گفتگو میں ہم واقعاتی صورتحال سے اور خصوصاً حمات (شام کا شہر) کے سانحہ کی روشنی میں اس امر کی نشاندہی کر آئے ہیں کہ ایک مطلوب اور معقول حد تک معاشرے پر براہِ راست اثر انداز ہونے کی صلاحیت سے جب تک پوری طرح لیس نہیں ہو لیا جاتا تب تک برسرِ اقتدار قوتوں سے الجھنا سراسر عبث اور بے سود ہے اور اس سے اسلام کے تحریکی عمل کے ہاتھ سوائے اس کے کچھ اور ہاتھ آنے کا نہیں جو سانحہ حمات میں ہوا۔ اسی طرح ہم جلد بازی کی راہ پر عمل پیرا بزرگوں سے بھی کچھ گفتگو کرنا چاہیں گے جو یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام کے تحریکی عمل کو آگے بڑھانا اب اسی پارلیمانی راستے سے ممکن ہے اور ایک یہی راستہ ایسا ہے جو آگے جا کر کہیں بند نہیں ہوتا اور اسی سے اہلِ اسلام کی امیدیں اور آرزوئیں روئے عمل میں آ سکتی ہیں۔ ان حضرات کو بھی ہم وہی بات کہیں گے کہ یہ راستہ بھی عبث ہے اور معاشرے پر اثر انداز ہونے کے عمل کو ایک خاصی مطلوبہ سطح تک پہنچانے سے پہلے اس سے کچھ بھی برآمد نہیں ہو سکتا۔

ذرا دیر کے لیے چلیے ہم فرض کر لیتے ہیں کہ پارلیمنٹ میں سو فیصد اسلام پسند اکثریت لے آنے میں کامیابی حاصل کر لی جاتی ہے اور پارلیمنٹ کے سب ارکان اللہ کی شریعت کا نفاذ چاہنے والے آ جاتے ہیں۔ اب اگر نیچے معاشرے پر اثر انداز ہونے والی وہ قوت نہ ہو جو کہ اسلامی اقتدار کے لیے اصل سہارا فراہم کرنے کے لیے ناگزیر ہے، ایسی کوئی معاشرتی اور تربیتی بنیاد جو اسلام کے اقتدار کو وجود میں لانے اور پھر برسرِ وجود رکھنے کے لیے ضروری ہے، اگر نہ ہو تو اس کے بغیر یہ پارلیمنٹ کیا کرے گی؟ ایک فوجی انقلاب پارلیمان کو برخاست کر کے اسلام پسند ارکانِ پارلیمان کو جیلوں میں ٹھونس دے اور سب کیا دھرا وہیں کا وہیں رہ جائے۔ کیا یہ

ناممکن ہے؟

چاہے ایسا منہج اختیار کرنے کی کوئی بھی وجوہات ہوں مگر اس کی کامیابی کا خیال محض سادہ خیالی ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ اس میں بہت سے شرعی نقصانات مضمر ہیں اور یہ اتنے بڑے بڑے نقصانات ہیں جو دعوت کے دل میں جا کر لگنے والے تیر کے مترادف ہیں اور باوجود اس کے کہ بظاہر یہ چیز دعوت کو ایک بڑا میدان ملنے اور اسے تیزی کے ساتھ آگے بڑھنے میں مدد دیتی نظر آتی ہے' مگر حقیقت میں یہ دعوت ہی کے پاؤں کی زنجیر بن جاتی ہے۔

سب سے پہلا نقصان تو یہ ہے کہ یہ عقیدے کے ساتھ متعارض ہے۔ ایک مسلمان جسے اس کے دین کا حکم ہے کہ انسانی زندگی کے ہر مسئلہ کا فیصلہ صرف اور صرف اللہ کی شریعت سے کرائے' جسے اس کا دین بتائے کہ اللہ کی حکمرانی کے سوا حکمرانی کی ہر قسم جاہلیت ہے' اسے نہ تو قبول کرنا جائز ہے' نہ اس پر رضامند ہونا اور نہ اس میں شریک ہونا۔ ایک ایسے مسلمان کے لیے آخر یہ کیونکر جائز ہوگا کہ وہ ایک ایسے ایوان میں شمولیت رکھے جو اللہ کی نازل کردہ شریعت کے بجائے خود قانون صادر کرنا اپنے لیے روا رکھتا ہے اور جو مجموعی طور پر اپنے عملی رویّے سے ہر موقع پر ببانگ دہل یہ اعلان کر رہا ہوتا ہے کہ اسے ہر ہر معاملے میں اللہ سے فیصلہ کروانا قبول نہیں؟ اس کے لیے کیونکر جائز ہے کہ وہ ایسے ایوان میں شرکت کرے؟ کجا یہ کہ وہ اس سے حلف وفاداری اٹھائے' اس کی پاسداری کا عہد کرے' اور اس دستور کا بھی حلف اٹھائے جس سے یہ ایوان اپنے وجود کے لیے وجہ جواز حاصل کرتا ہے؟ جبکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ ۚ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ۭ﴾ (النساء: ۱۴۰)

''اللہ تمہیں اس کتاب میں اس سے پہلے بھی یہ حکم دے چکا ہے کہ جہاں تم سنو کہ اللہ کی آیات کے ساتھ کفر ہو رہا ہے اور ان کا مذاق اڑایا جا رہا ہے وہاں نہ بیٹھو جب تک کہ یہ لوگ کسی دوسری بات میں نہ لگ جائیں۔ اب اگر تم ایسا کرتے ہو تو تم بھی انہی کی طرح ہو۔''

جبکہ ان کا تو صبح شام کام ہی اللہ کی شریعت کے خلاف چلنا اور اس سے اعراض اور روگردانی کرنا ہے۔ اس کے علاوہ اس ایوان کا اور کیا کام ہے جس میں ان کے مصروف ہونے کا آدمی انتظار کرے! ایسے میں ان کے ساتھ کس طرح بیٹھا جا سکتا ہے؟



وہ تمام عذر جو اس سلسلے میں بیان کیے جاتے ہیں کہ: ''ہم ان کو وہاں اسلام کی بات پہنچاتے ہیں''، ''ہم بار بار یہ واضح کرتے رہتے ہیں کہ ہمیں اللہ کی اتاری ہوئی شریعت کے سوا کوئی قانون سازی قبول نہیں''، ''ہم ایک باقاعدہ اور رسمی فورم پر جا کے بات کرنا چاہتے ہیں اور شریعت سے فیصلے کروانے کی دعوت دینے وہاں جاتے ہیں'' یہ سب کے سب عذر اس بات کے لیے وجہ جواز نہیں بنتے کہ یہ کام کرنے میں عقیدۂ توحید سے جو واضح تعارض لازم آتا ہے' اس کی اجازت نکل آئے۔ کہتے ہیں: ''کیا اللہ کے نبی ﷺ قریش کی مجلس (ندوہ) میں ان کو اللہ کا کلام پہنچانے کے لیے تشریف نہیں لے جایا کرتے تھے''؟ بالکل! اللہ کے نبی ﷺ ان کو اللہ کی پکڑ سے ڈرانے کے لیے ان کی مجلس میں تشریف لے جایا کرتے تھے مگر وہ ان کی مجلس کی رکنیت اختیار نہیں کرتے تھے!

ہاں آج بھی کوئی مسلمان جو اس بات کی دعوت دینا چاہتا ہے کہ انسانی زندگی کے سب فیصلے اللہ کی شریعت سے کروائے جائیں' ایسا کوئی موقع اگر پا لیتا ہے کہ اس دور کی جاہلیت کی ندوہ (مجلس) میں چلا جائے اور اس کو وہاں اپنی بات رکھنے کی کم از کم اس قدر اجازت مل جائے جتنی کہ پرانے دور کی جاہلیت رسول اللہ ﷺ کو اپنی مجلس میں بات کر لینے کی اجازت دے دیا کرتی تھی تو اس پر یقیناً واجب ہوگا کہ وہ وہاں جائے اور اللہ کا پیغام پہنچا کر آئے۔ کیونکہ اس صورت میں وہ اس ندوہ (ایوان) کا رکن اور باقاعدہ حصہ نہ ہوگا۔ یہ وہاں باہر سے آئے ہوئے بس ایک داعی کی حیثیت سے جائے گا۔ یہاں وہ یہ دعوت دے گا کہ جو اللہ کے ہاں سے اترا ہے یہ لوگ اس کے پیروکار بن جانے پر عمل پیرا ہوں۔ نہ تو ایوان کسی صورت اس کو اپنا حصہ جانے اور نہ وہ خود اپنے آپ کو اس کا رکن سمجھے۔ یہ ایک ایسا شخص ہوگا جو وہاں اپنے رب کی بات پہنچانے آیا تھا اور اپنا کام کر کے وہاں سے چل دیا۔ رہا یہ کہ اس ندوہ (ایوان) کی رکنیت اختیار کرنے کے لیے دوڑ دھوپ کی جائے اور دلیل یہ ہو کہ اس سے حق کی بات پہنچانے کا موقع ملتا ہے' تو اس بات پر اللہ کے دین سے کوئی سند موجود نہیں۔

ہم ہر موقع پر عوام کو یہی بتاتے ہیں کہ ہر وہ نظام جو اللہ کی شریعت پر قائم نہیں' باطل ہے اور یہ کہ کسی ایسے نظام کو دنیا میں وجود رکھنے کا کوئی حق نہیں جو اللہ کی شریعت پر نہیں چلتا۔ پھر دوسری طرف یہی عوام دیکھتے ہیں کہ ہم اسی نظام کا جا کر حصہ بنتے ہیں جس کو ختم کر دینے کی ہم عوام میں ہر وقت بات کرتے ہیں! اس کا نتیجہ؟ اگر ہمیں اپنے لیے بالفرض ایسے دلائل مل بھی جاتے ہیں جس سے ہمارے لیے اس نظام کا حصہ بننا جائز ہو جائے تو جس نظام کو عوام میں ہم

صبح شام باطل باطل کہتے ہیں تو آخر عوام سے یہ توقع کیسے رکھی جائے کہ وہ اس نظام کا حصہ نہ بنیں یا اس نظام کو اسی قدر بُرا جانیں جتنا کہ جاننا ضروری ہے اور جسے جانے بغیر وہ زوردار معاشرتی بنیاد اٹھائی ہی نہیں جاسکتی جو اس نظام کے خاتمے پر منتج ہو؟ آخر اس صورت میں معاشرے کی ذہنیت کا رُخ سرتا پیر تبدیل کر دینے کا وہ کام کیسے مکمل ہوگا جس پر اسلام کے اقتدار کی اصل بنیاد رکھی جانا ہے؟ پورے کے پورے معاشرے کو ذہنی اور شعوری طور پر عزم و یقین کی اس سطح تک لے جانا جہاں اللہ کے حکم اور نظام کے سوا ہر جاہلی حکم اور نظام کا وجود مکمل طور پر ناقابلِ برداشت اور نفرت کی آخری حد کو پہنچ جائے' اس نظام کا حصہ بن جانے کے بعد کیسے ممکن رہ جاتا ہے؟

ہم یہ سمجھ لیتے ہیں کہ پارلیمنٹ میں شامل ہو کر ہم اسلام کی معاشرتی بنیاد اٹھانے کا کام آسان کرتے ہیں' کیونکہ اس طریقے سے ہم ملک کے ایک مقتدر فورم پر جا کر بات کریں گے اور لوگوں کے لیے اس کی صدائے بازگشت سننا آسان ہو جائے گا' لیکن حقیقت میں ہم اس معاشرتی تبدیلی اور اس معاشرتی بنیاد اٹھانے کے عمل کو کہیں مشکل کر لیتے ہیں۔ کیونکہ اسلام کا اس جاہلیت کے ساتھ ازل سے جو تنازعہ ہے کہ یہاں صرف اللہ کی چلے گی' یہ جھگڑا اور یہ تنازعہ کہیں بے جان ہو کر رہ جاتا ہے۔ عوام کو ضرورت ہے کہ ان کے ذہن و تصور کے ہر گوشے میں اس باطل نظام کو بالکل ایک قطعی اور دوٹوک انداز میں مسترد کر دینے اور اسے آخری حد تک ناقابلِ برداشت سمجھنے کا رویہ پروان چڑھایا جائے۔ ہمارے ایوان میں جا بیٹھنے سے اب اس بات کا امکان ہی ختم ہو جاتا ہے۔

معاشرے پر اثر انداز ہونے اور معاشرے کا تمام تر رخ جاہلیت سے ہٹا کر اسلام اور اسلامی قیادت کی طرف موڑ دینے کا دشوار عمل اپنے اس مطلوبہ حجم کو پہنچ ہی نہیں سکتا' جہاں یہ اسلامی اقتدار کے لیے مضبوط اور حتمی سہارا بنے' جب تک عوام کے شعور میں اس حد تک پختگی نہ لائی جائے اور جب تک معاشرے کو اس معاملے میں یقین کی آخری حد تک نہ پہنچا لیا جائے کہ معاشرے پر اسلام کی جانب سے از روئے عقیدہ یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنے اوپر صرف اور صرف اللہ کا حکم قائم کروائے اور اس کے علاوہ اپنے اوپر کسی اور نظام کے وجود کا سوال تک باقی نہ رہنے دے۔ عوام کو اس نظام کے ساتھ ترکِ موالات میں اس حد تک آگے لے جانا ممکن ہی نہیں رہتا جب آپ خود اس کے اندر چلے جاتے ہیں۔

اس منہج کو اپنانے کا تیسرا بڑا نقصان یہ ہے کہ سیاست کا یہ کھیل' جیسا کہ تجربات نے



ثابت کر دیا ہے' ایک ایسا کھیل ہے جس میں کمزور کھایا جاتا ہے اور طاقتور اسے نگلتا ہے۔ اس میں کمزور کے لیے ایسا کوئی موقع نہیں رہنے دیا جاتا کہ وہ طاقتور کو کسی وقت غافل پا کر اور اس کی آنکھ بچا کر اس کے ہاتھ سے اقتدار لے جائے۔ سیاست کے اس کھیل میں حقیقت یہ ہے کہ ضعیفی اور طاقتوری کا 'حق اور باطل' کے مسئلے سے بالکل کوئی تعلق نہیں۔ حتیٰ کہ آپ یقین کریں گے کہ اس کا کثرت اور قلّت سے بھی کوئی تعلق نہیں۔ کتنی بار آپ دیکھتے ہیں کہ ان ملکوں میں کوئی بہت چھوٹا سا طبقہ جسے لوگ مُنہ لگانے کو بھی تیار نہیں ہوتے کبھی کبھار اس کا بھی یہاں نصیب جاگ اٹھتا ہے۔ ملک کے اندر عسکری قوت کا سہارا اور بیرونی سطح پر اس وقت کی عالمی شیطانی قوتوں میں سے کسی کی سرپرستی حاصل ہو جائے تو آپ دیکھیں گے کہ ایسا طبقہ بھی یہاں ناقابلِ تسخیر ہو جاتا ہے' چاہے معاشرے میں اس کی بالکل بھی جڑیں گہری نہ ہوں۔ دوسری طرف آپ دیکھیں گے کہ ایک بہت بڑا طبقہ بھی یہاں مجبور اور مقہور بنا ہوتا ہے چاہے ملک میں اس طبقے کی بہت بڑی اکثریت ہی کیوں نہ ہو۔

یہی وجہ ہے کہ یہاں وہ اسلامی جماعتیں جو اسلام کے دشمنوں کے بنائے اور چلائے ہوئے نظاموں میں جا کر حصّہ لیتی ہیں' سیاست کے اس کھیل میں ہر بار ہی یہ جماعتیں خالی ہاتھ رہتی ہیں اور ہر بار ہی دشمنوں کا پلّہ بھاری رہتا ہے۔ وہ اس سے بے شمار فوائد سمیٹتے ہیں۔ ایک تو وہ عوام الناس کے سامنے اپنے نظام کی شہرت اچھی کرتے ہیں کہ اسلامی جماعتیں اس میں شامل ہوئیں یا ان کے ساتھ انتخابی تعاون یا اتحاد کرتی رہیں یا کسی اور پارلیمانی معاملے میں ان کے ساتھ باہمی اشتراک رکھتی رہیں۔ دوسرا وہ اسلام پسندوں کے اصل مسئلے اور ان کی اصل دعوت کو بے جان کر لینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں' کیونکہ اس عمل کے نتیجے میں اسلام پسند اب پہلے کی طرح جاہلیت سے الگ تھلگ اور منفرد و متمیّز نظر نہیں آتے جیسا کہ سیاست کے اس کھیل میں شامل ہونے سے پہلے ان کی ایک خاص انفرادیت اور امتیاز ہوا کرتا تھا اور ان کا اس نظام میں الگ تھلگ رہنا ہر ایک کی نظروں میں آ جانے کا باعث تھا۔ تب لوگ اس سے یہ تاثر لیتے تھے کہ ان اسلام پسندوں کے پیشِ نظر ضرور کوئی بہت بڑا اور عظیم الشان مسئلہ ہے جسے یہ تمام تر پارلیمانوں اور ایوانوں سے زیادہ مقدس اور حرمت والا سمجھتے ہیں اور جس کے تحفظ کی خاطر ان کو جاہلیت کے ایوانوں میں قدم رکھنا تک گوارا نہیں۔ سب دیکھنے والوں کو یہ نظر آتا تھا کہ اسلام پسند اقتدار کی اس جنگ میں کوئی فریق بننے کے لیے تیار نہیں جس کے لیے دنیا پر مرنے والوں کی جان جاتی ہے۔ جس کے چند روزہ اقتدار پر جان دینے والے لوگ سب

اخلاق' سب اقدار اور سب اسلامی روایات کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔ تب لوگ اسلام پسندوں کی اپنے دل پر ایک ہیبت محسوس کیا کرتے تھے کہ یہ اس میدان سے اس لیے پرے ہیں کہ یہاں جاہلی شعائر کی صدا بلند ہوتی ہے اور اللہ کی شریعت کو پسِ پشت ڈال دیا جاتا ہے۔

ایسا تو سیاست کے اس کھیل میں آج تک کبھی ایک بار بھی نہیں ہوا کہ کوئی کمزور طبقہ یہاں انتظامی امور کا مالک بن بیٹھا ہو اور اس طاقتور دشمن کا شروع کیا ہوا کھیل کسی کمزور نے جیت لیا ہو۔ پہیہ گھومتا ضرور ہے مگر پہیہ ہاتھ میں آ جانے سے گاڑی کا کنٹرول نہیں ملتا۔ ہاں جہاں سے گاڑی کے سب پُرزے چلتے ہیں وہاں سے پہیوں کو بھی گھما لیا جاتا ہے۔ جہاں تک ان جزوی قسم کی اصلاحات کا تعلق ہے جو اسلام پسند زندگی کے چند ایک شعبوں کے اندر لے آنے میں کبھی کامیاب ہو جاتے ہیں تو جاہلیت کو وہ بھی برداشت نہیں ہوتیں اور آپ دیکھتے ہیں کہ کچھ ہی دیر بعد ان اصلاحات کا بھی وہ ستیاناس کر کے رکھ دیتی ہے۔ البتہ اسلام اور جاہلیت کے تنازع کو جو بے جان کر دیا گیا ہوتا ہے' اس کے منفی اثرات پوری طرح باقی رہتے ہیں۔ ان اثرات کو مٹانا پھر کبھی آسان نہیں رہتا۔ اب یہ اسلام اور جاہلیت کے باہم قریب آنے کا تاثر اتنا برا اور نقصان دہ ہے کہ جزوی اصلاحات اور تبدیلیوں کا جو کوئی بھی فائدہ اس نظام میں جا کر ہوتا ہے وہ اس بڑے نقصان کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ قرآن پاک کی یہ بات اس پر نا قابلِ یقین حد تک پوری اترتی ہے:

﴿فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَآ أَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا﴾(البقرۃ:۲۱۹)

''شراب اور جوئے میں بڑی خرابی ہے' اگرچہ ان میں لوگوں کے لیے کچھ منافع بھی ہیں' مگر ان کا گناہ ان کے فائدے سے بہت زیادہ ہے۔''

رہا یہ سوچنا کہ جاہلیت کو غافل پا کر اسلام پسند پارلیمان میں چپکے سے اقتدار کی سیڑھیاں چڑھتے جائیں گے اور حکمران طبقوں کی آنکھ بچا کر کسی دن اقتدار ہاتھ میں کر لیں گے اور یوں اسلام کی حکومت قائم ہو جائے گی تو اس اندازِ فکر کو سادہ خیالی کہہ دینے سے بھی اس کی پوری تصویر کشی ممکن نہیں۔ (الجزائر میں جو کچھ ہوا' میں سمجھتا ہوں ہمارا یہ وہم دور کر دینے کے لیے وہ بہت کافی ہے۔ اس کے بعد بھی کسی کے ذہن میں کوئی ایسا وہم باقی ہے تو حقائق کی دنیا میں اس کی بہرحال کوئی گنجائش نہیں۔ مترجم)

**(ماخوذ از واقعنا المعاصر' ص ۴۳۶۔۴۴۳)**

# انسان کا مقصدِ حیات: ترقّی یا نجات؟

محمد عمران صدیقی

ترقی! ترقی! ترقی! ہر فرد کی کوشش کا محور یہی ہے۔ ہر معاشرہ ترقی کی منزلیں طے کرنا چاہتا ہے اور ہر حکومت اسی میں ملک وقوم کی کامیابی تصور کرتی ہے۔ انسانی حیات کی ہر تین سطحوں پر یعنی فرد، معاشرے اور حکومت کی کامیابی کا تصور ''ترقی'' کے ساتھ جڑا ہے۔ کامیاب فرد وہی ہے جو مسلسل ترقی کر رہا ہو، کامیاب معاشرہ وہی ہے جو مسلسل ترقی کی راہ پر گامزن ہو، کامیاب حکومت ومملکت وہی ہے جو ترقی پذیر سے ترقی یافتہ اور ترقی یافتہ سے آگے مزید ترقی کی طرف رواں دواں ہو۔

کامیابی کا پیمانہ 'ترقی' ہے تو 'ترقی' کا پیمانہ فی کس آمدنی (per capital income) یا پھر تسخیرِ کائنات ہے۔ جس معاشرے میں فی کس آمدنی جس قدر زیادہ ہوگی اسی قدر وہ ترقی یافتہ کہلائے گا، مگر اس کے لیے یہ بھی ضروری قرار دیا گیا ہے کہ فی کس آمدنی کا یہ معیار تسخیرِ کائنات یعنی سائنس وٹیکنالوجی اور سوشل سائنسز کے علوم کے ذریعے حاصل کیا گیا ہو، نہ کہ قدرتی اور معدنی دولت کے ذریعے، اس لیے سعودی عرب یا کویت جتنے بھی مالدار ملک ہوں اور ان کے ہاں فی کس آمدنی بھی کتنی ہی اچھی ہو لیکن یہ ممالک ترقی یافتہ نہیں کہلائے جا سکتے، کیونکہ ان ممالک میں فی کس آمدنی کا معیار اور دولت کی یہ ریل پیل سائنس وٹیکنالوجی کے ذریعے نہیں بلکہ قدرتی معدنی وسائل کے ذریعے ہے۔

اپنی اس اصل میں ترقی شاید کوئی بُرائی محسوس نہ ہوتی ہو کہ فی کس آمدنی میں اضافہ یا سائنس وٹیکنالوجی میں اضافہ میں کیا برائی ہے۔ مگر ہم جس عنوان پر بات کرنا چاہتے ہیں وہ ہے ''ترقی یا نجات، بطور مقصدِ حیات''، یعنی انسانی زندگی کا مقصود کیا ہے؟ انسان کی کامیابی کا معیار



کیا ہے؟ فوز وفلاح کا پیمانہ اور میزان کیا ہے؟ فرد، معاشرہ یا حکومت کی سطح پر کون سا فرد کامیاب وکامران کہلائے گا، کون سا معاشرہ فوز وفلاح پائے گا اور کون سی حکومت اپنے ملک و قوم کی خیر خواہ مانی جائے گی؟ اس کا جواب آج کی جاہلیتِ جدیدہ 'ترقی' کے نام سے دیتی ہے اور اسلام 'نجات' کے نام سے۔

جاہلیتِ جدیدہ کے ہاں کوئی بھی فرد اس وقت کامیاب وکامران گنا جائے گا جب وہ ترقی کر رہا ہو، اس کے سرمائے میں اضافہ ہو رہا ہو اور وہ 'آزادی' اور 'مساوات' کی اقدار میں آگے بڑھ رہا ہو۔ جبکہ اسلام کی نظر میں کوئی شخص اس وقت کامیاب وکامران گنا جاتا ہے جب وہ دنیا میں ہدایت یافتہ اور آخرت میں 'نجات' پانے والا بن جائے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ؕ﴾ (آل عمران:۱۸۵)

''کامیاب دراصل وہ ہے جو وہاں آتشِ جہنم سے بچ جائے اور جنت میں داخل کر دیا جائے۔''

نیز فرمایا:

﴿اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ اَمَلًا ۝﴾ (الکھف)

''یہ مال اور اولاد محض زندگی کی ایک ہنگامی آرائش ہے۔ اصل میں تو باقی رہ جانے والی نیکیاں ہی تیرے رب کے نزدیک نتیجے کے لحاظ سے بہتر ہیں۔''

﴿اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ؕ وَفَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِى الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ ۝﴾ (الرعد)

''اللہ کشادہ کرتا ہے روزی جس کی چاہے اور تنگ کرتا ہے۔ اور یہ لوگ دُنیوی زندگی میں مگن ہیں، حالانکہ دُنیا کی زندگی آخرت کے مقابلے میں متاعِ قلیل کے سوا کچھ بھی نہیں۔''

اس دُنیوی زندگی میں اللہ کے پیغمبر ﷺ کی تعلیمات (قرآن وحدیث) کی پیروی کا نام 'ہدایت' ہے اور اُس دنیا (آخرت) میں اللہ تعالیٰ کی رحمت سے عذابِ جہنم سے بچ کر نعمت جنت میں جانے کا نام 'نجات' ہے۔ اب اگر کوئی شخص دُنیوی اعتبار سے 'ترقی' نہ کر رہا ہو، یعنی نہ تو اس کی دولت اور سرمائے میں اضافہ ہو رہا ہے اور نہ وہ دنیا کی تسخیر میں آگے بڑھ رہا ہو تو ایسے شخص کے بارے میں یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ دنیا کی دوڑ میں پیچھے رہ گیا ہے، لیکن اسلام

اس کو ناکام و نامراد فرد کے طور پر نہیں لیتا' بلکہ دین اسلام کے مطابق ناکام و نامراد تو وہ بدنصیب ہے جو ہدایت نہ پا سکا' وحی جیسی نعمت کی پیروی سے محروم رہا' توحید کی مٹھاس نہ چکھ سکا' گمراہی وظلمت کے اندھیروں میں بھٹکتا رہا' وحی کے علم سے بے بہرہ اور اس کی پیروی سے اعراض کرتا رہا' شرک کا زہر گھونٹ گھونٹ بھرتا رہا' مرتا رہا اور نتیجتاً جنّت سے محروم ہوا اور جہنّم کا ایندھن بنا دیا گیا۔

﴿وَالْعَصْرِ ① اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ② اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ③﴾ (العصر)

''زمانے کی قسم' انسان درحقیقت خسارے میں ہے۔ سوائے اُن لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے' اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔''

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((رُبَّ اَشْعَثَ مَدْفُوْعٍ بِالْاَبْوَابِ لَوْ اَقْسَمَ عَلَی اللّٰهِ لَاَبَرَّهٗ)) (۱)

''بہت لوگ پریشان حال' بال غبار آلودہ' دروازوں سے دھکیلے ہوئے ایسے ہیں کہ اگر اللہ کے اعتماد پر کسی بات کی قسم کھا بیٹھیں تو اللہ اُن کی قسم کو سچا کر دے۔''

یہاں یہ بھی نوٹ کر لیجیے کہ دنیاوی اعتبار سے ترقی کرنا ہمارا مقصدِ حیات تو نہیں لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب بھی نہیں کہ یہ دنیا کافروں کے لیے چھوڑ دی جائے اور راہبوں' صوفیوں اور پنڈتوں کی طرح مردم بیزار اور دنیا سے بے نیاز ہو کر رہا جائے' حاشا وکلا' نہ تو یہ ہمارا مقصد ہے اور نہ ہی یہ اسلام کی تعلیم ہے۔ بلکہ مالکِ کائنات نے تو ہمیں یہ دعا سکھلائی ہے کہ ہم دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی مانگتے رہیں:

﴿رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۲۰۱﴾ (البقرة)

''اے ہمارے ربّ! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔''

اور رب کائنات نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ ہم اپنے دنیوی حصے کو بھی فراموش نہ کریں:

﴿وَلَا تَنْسَ نَصِیْبَكَ مِنَ الدُّنْیَا وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَیْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِی الْاَرْضِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُفْسِدِیْنَ ۷۷﴾ (القصص)



''اور دُنیا میں سے اپنا حصہ فراموش نہ کر' اور احسان کر جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے اور زمین میں فساد برپا کرنے کی کوشش نہ کر' یقیناً اللہ مفسدوں کو پسند نہیں کرتا۔''

دُنیا اپنی تمام تر زیب وزینت' مال و دولت' عورت وشہرت اور اقتدار ولشکر سمیت لازمۂ حیات بھی ہے اور ضرورتِ زندگی بھی' مگر نہ تو یہ مقصودِ حیات ہے اور نہ ہی کامیابی کی علامت وضمانت۔ مقصودِ حیات 'ہدایت' ہے اور کامیابی کی علامت وضمانت 'نجات' ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿زُیِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِیْنَ وَالْقَنَاطِیْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَیْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ۭ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ۱۴﴾ (آل عمران)

''لوگوں کے لیے مرغوباتِ نفس — عورتیں' اولاد' سونے چاندی کے ڈھیر' چیدہ گھوڑے' مویشی اور کھیتیاں (زرعی زمینیں) — بڑی خوش آئند بنا دی گئی ہیں' مگر یہ سب دنیا کی چند روزہ زندگی کا سامان ہیں۔ حقیقت میں جو بہتر ٹھکانا ہے وہ اللہ کے پاس ہے۔''

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَا مِنْ غَازِیَةٍ تَغْزُوْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَیُصِیْبُوْنَ الْغَنِیْمَةَ اِلَّا تَعَجَّلُوْا ثُلُثَیْ اَجْرِهِمْ مِنَ الْآخِرَةِ وَیَبْقٰی لَهُمُ الثُّلُثُ' وَاِنْ لَّمْ یُصِیْبُوْا غَنِیْمَةً تَمَّ لَهُمْ اَجْرُهُمْ)) (۲)

''جب مجاہد اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور انہیں (امن وسلامتی سے) غنیمت مل جاتی ہے تو انہوں نے اپنا دو تہائی ثواب دنیا میں پا لیا اور ایک تہائی باقی رہ گیا' اور اگر (مصیبت یا شکست کی وجہ سے) وہ غنیمت حاصل نہ کر سکیں تو وہ پورے ثواب کے مستحق ہو جائیں گے۔''

امیر المومنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دورِ مبارک میں فتح فارس کے موقع پر مدینہ منوّرہ کے بیت المال میں سونے چاندی کے ڈھیر جمع ہو رہے ہیں' لوگ اس پر خوشی کا اظہار کر رہے ہیں' جبکہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ رو رہے ہیں۔ ساتھیوں نے پوچھا تو فرمایا کہ کہیں ہمارے اعمال کا بدلہ ہمیں اسی دنیا میں نہ مل رہا ہو جبکہ ہم نے تو وہ آخرت کے لیے کیے ہیں۔ یہ اعلیٰ وارفع کردار ہمارے خلیفۂ راشد سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا ہے جو ملک بھی فتح کر رہے ہیں' قوموں کو زیر نگین بھی

لا رہے ہیں' مگر اس کو کامیابی کا معیار اور کامرانی کی علامت نہیں سمجھا جا رہا بلکہ الٹا اس دُنیوی ترقی پر آنسو بہا رہے ہیں کہ کہیں ہمارے نیک اعمال کا بدلہ اس دُنیوی کامیابی کی صورت میں اسی دنیا میں تو نہیں دیا جا رہا۔

'جاہلیتِ جدیدہ' کے ہاں جب 'ترقی' مقصدِ حیات ٹھہری تو باقی ہر چیز پست ہوگئی۔ مذہب' عقیدہ' اخلاق' شریعت الغرض جو چیز بھی ترقی کی راہ میں حائل ہو اس کے بارے میں کہا گیا کہ اسے توڑ ڈالو' تباہ کر دو' بدل دو۔ چنانچہ ترقی کی راہ میں جب مذہب حائل ہوا تو انہوں نے اسے بھی بیڑیاں سمجھ کر توڑ ڈالا' وحیٔ الٰہی کی پیروی سے انکار کر دیا' کتابِ الٰہی کو دستورِ از کار رفتہ قرار دے دیا۔ عقیدہ جب ترقی کی راہ میں حائل ہوا تو 'لا اُدری' کہہ کر اللہ پروردگارِ عالم اور آخرت کی جزا و سزا کو اپنی زندگی سے لاتعلق کر لیا۔ اخلاق حائل ہوا تو معیارِ اخلاق ہی بدل ڈالا' مذہب اور فطرت کی بجائے عالمگیریت اور مادی غلبہ اخلاق کا معیار بن گئے۔ حلال و حرام کے الٰہی ضابطے ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنے تو انہوں نے حلال و حرام کے پیمانے خود گھڑ لیے۔ اب حلال و حرام وہ نہیں جس کو اللہ تعالیٰ' کتاب اللہ اور رسول اللہ ﷺ حلال و حرام قرار دیں' بلکہ ہر وہ چیز حلال ہے جو ترقی کی راہ میں معاون بنے' مثلاً آزادی' مساوات' سود' فحاشی' ملکوں اور ان کے وسائل پر ناجائز قبضے' بلا جواز خون ریزی اور اقتدار کے نشے میں قوموں اور نسلوں کی تباہی۔ یہ تمام کی تمام احکم الحاکمین کے قاعدے کی رو سے تو حرام ہیں' مگر چونکہ یہ ''ترقی'' کی راہ میں حائل ہیں اس لیے جاہلیت جدیدہ انہیں جائز بلکہ بسا اوقات ضروری اور لازمی قرار دیتی ہے۔ اسی طرح ہر وہ چیز حرام ہے جو ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنے۔ علم صرف وہی پسندیدہ ہے جو ترقی میں معاون ہو اور شخصیت وہی محبوب ہے جو ترقی پسند ہو۔ جو مدرسہ 'نجات' کا علم پڑھائے اور جو شخصیت 'ہدایت' کی طالب ہو جاہلیت کے اس معاشرے' جاہلیتِ جدیدہ کے اس دور اور جاہلیت کی حکمرانی میں اس کا نہ کوئی مقام و مرتبہ ہے نہ کوئی وقار و احترام۔

ہم مسلمان ایمان رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات اور موت و حیات کو امتحان و آزمائش کے لیے پیدا فرمایا ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ط﴾ (الملک:۲)

''(اللہ وہ ذات ہے) جس نے موت اور زندگی کو ایجاد کیا تاکہ تم لوگوں کو آزما کر دیکھے کہ تم میں سے کون اچھے عمل کرنے والا ہے۔''



اور مالکِ کائنات نے ہمیں حکم فرمایا کہ ہم اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو جہنم کی آگ سے بچانے کی فکر کریں:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَاَھْلِیْکُمْ نَارًا﴾ (التحریم:۶)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو آگ سے۔''

مگر بدقسمتی سے ہم لوگ (مسلمان) بھی جس شخصیت کو ترتیب دیتے ہیں' جس معاشرہ کو بناتے ہیں اور جو حکومت اور نظام چلاتے ہیں وہ ترقی کے لیے تو معاون ہوتا ہے لیکن 'نجات' و 'ہدایت' کے مخالف ہوتا ہے یا لاتعلق۔ ہمارے سکولز' کالجز اور یونیورسٹیز جو تعلیم دے رہے ہیں' آئندہ نسلوں کی جو شخصیت ترتیب دے رہے ہیں' جو ذہنیت پروان چڑھ رہی ہے اور جو تعلیمی نصاب بنا رہے ہیں وہ سب کے سب طالب علموں کو 'ترقی' کے لیے تیار کرتے ہیں۔ سائنسی علوم یا سوشل سائنسز کی تعلیم تو ہوتی ہی 'ترقی' کے لیے ہے' یہاں تو 'اسلامیات' کی تعلیم بھی نجات اور ہدایت کے لیے نہیں بلکہ ترقی کی غرض سے لی اور دی جاتی ہے۔ سائنسی علوم پڑھنے والے طلبہ و طالبات ہوں یا سوشل سائنسز پڑھنے والے' آپ کبھی ان کے ماحول اور مباحث کو دیکھ لیجیے اور سن لیجیے آپ کو خود اندازہ ہو جائے گا کہ یہ جاہلیتِ جدیدہ کی 'ترقی' کی راہ پر گامزن ہیں اور اسی 'ترقی' کو انہوں نے اپنا مقصدِ حیات بنا لیا ہے۔

اسی طرح میڈیا کے ذریعے قوم کی جو ذہنیت بنائی جا رہی ہے' اخبارات و رسائل' ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعے جو تربیت کی جاتی ہے' جو سبق اور تعلیم پھیلائی جاتی ہے' ڈرامہ' فلم' ادب' نثر' نظم اور افسانہ کے ذریعے جو کچھ سکھایا جاتا ہے وہ مسلمانوں کو نجات و ہدایت کے بجائے ترقی کو مقصدِ حیات بنانے میں مدد کرتا ہے۔

سماجی سطح پر این جی اوز' معاشی سطح پر سودی ادارے' سیاسی سطح پر حاکمیتِ جمہور' عالمی سطح پر آئی ایم ایف' ورلڈ بینک اور یو این او وغیرہ سب ہی ادارے ترقی ہی کو انسانی حیات کا مطمحِ نظر قرار دیتے ہیں اور انسان کو اس کی حقیقی فوز و فلاح اور ہدایت و نجات سے غافل کرنے میں اپنا اپنا کردار بھرپور طریقے سے ادا کر رہے ہیں۔

یوں موجودہ دور کے تمام ادارے' سماجی سطح پر ہوں یا سیاسی سطح پر' تعلیمی ادارے ہوں یا معاشی ادارے' سائنس کے علوم ہوں یا سوشل سائنس کے' ادب ہو یا تاریخ' انسانوں کو اسلام اور اس کی تعلیمات سے دور کرنے میں اپنا حصہ ڈال رہے ہیں۔ اس کے مقابلے میں اسلامی شخصیت' اسلامی معاشرہ اور اسلامی حکومت و ریاست ہر سطح پر (چاہے وہ انفرادی ہو یا اجتماعی'

عقیدہ ہو یا نظام)‘ توحیدِ باری تعالیٰ اور آخرت کی یاددہانی کے لیے برپا ہوتی ہے۔

آدم علیہ السلام سے لے کر محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام کے تمام انبیاء علیہم السلام اسی مقصد کو لے کر مبعوث ہوتے رہے۔ وہ کسی رہبانیت کا سبق نہیں دیتے تھے لیکن ترقیٔ دنیا کو بھی انسانی زندگی کا محور نہ بناتے تھے‘ بلکہ دنیا کے ہر معاملے کو وحی الٰہی کی روشنی میں طے کراتے رہے اور انسان کا مقصدِ پیدائش عبادت و بندگی اور منتہائے مقصود رضائے الٰہی اور نجاتِ اُخروی کو قرار دیتے رہے۔ پھر بعد میں اسی مقصدِ حیات کی تعلیم پیروانِ نبوت نے اپنے معاشروں میں عام کی۔ اسی مقصدِ حیات کے لیے اسلامی حکومت وخلافت برپا ہوتی رہی۔ اسلامی مدارس میں قرآن وسنّت اور ان سے ماخوذ عقائد‘ فقہ اور تزکیہ کے علوم جو انسان کو نجات کی راہ سمجھاتے ہیں‘ پڑھائے جاتے ہیں‘ جبکہ فنون‘ طب‘ ہندسہ‘ کیمیا‘ فلسفہ‘ منطق وغیرہ یا تو ردّ کے لیے سکھلائے جاتے ہیں یا پھر تخصص اور دیگر ضروریات کے لیے‘ اس لیے یہ علوم فرض کفایہ ہیں۔ جو علم فرضِ عین ہے وہ مقصودِ حیات یعنی ہدایت ونجات کا علم ہے۔ ہدایت ونجات کا بنیادی علم‘ جو کہ فرضِ عین کی حیثیت رکھتا ہے‘ جانے اور مانے بغیر کوئی شخص ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرلے یا انجینئر اور سائنسدان بن جائے‘ اسلام کی نظر میں وہ ماہرِ فن تو ہوگا مگر عالم ہرگز نہیں۔ اسی طرح کوئی بھی معاشرہ اور حکومت جو بندگیٔ ربّ‘ عدل اور نجات کے بجائے آزادی‘ جدید مساوات اور ترقی کی اقدار پر قائم ہو‘ اسلام کی نظر میں وہ جاہلی معاشرہ اور طاغوتی حکومت گنی جائے گی‘ جو اپنے افراد وعوام کو اللہ کی رضا اور جنت کے بجائے اللہ کے غضب اور جہنم کی طرف لے جانے کا سبب اور وسیلہ بنے گی۔

یاد رہے کہ ترقّی وتنزّلی کا یہ وہ تصور ہے جو جاہلی معاشروں میں پایا جاتا ہے اور مادی پیمانوں میں تولا جاتا ہے‘ جبکہ عروج وزوال کا اسلامی تصور اس سے بالکل الگ شے ہے۔ اسلامی حوالے سے تو ترقی مقصدِ حیات نہیں بلکہ نجات مقصدِ حیات ہے۔ لیکن کیا جاہلی اعتبار سے بھی انسان اور دنیا ترقی کی منزلیں طے کر رہے ہیں؟ بعض مفکرین کا یہ کہنا ہے: ’’انسان نے پرندوں کی طرح ہوا میں اڑنا اور مچھلیوں کی طرح سمندر میں تیرنا تو سیکھ لیا ہے لیکن انسان کی طرح زمین پر رہنا نہیں سیکھ سکا‘‘۔ اسی طرح یہ قول اپنی جگہ درست ہے کہ ترقی صرف اشیاء میں ہوئی ہے نہ کہ انسانیت میں‘ کیونکہ انسان تو پہلے سے بڑھ کر ظالم وجابر‘ متکبّر وسرکش‘ حرص و ہوس کا بندہ بن کر رہ گیا ہے جبکہ سائنس وٹیکنالوجی میں کافی ترقی ہوئی ہے۔



لیکن خود اس نقطۂ نظر پر بھی — کہ سائنس وٹیکنالوجی میں شاندار ترقی ممکن ہوئی ہے — مختلف مفکّرین نقد رکھتے ہیں۔ زاہد صدیق مغل صاحب لکھتے ہیں: ’’.....کئی دوسرے معیارات سے گھوڑا اور گدھا کار کے مقابلے میں زیادہ بہتر سواری کا نظام فراہم کرتے ہیں‘ مثلاً گھوڑے‘ اونٹ وغیرہ کی سواری کا یہ کمال تھا کہ یہ سواری ہر سال دو چار بچے بھی دیتی تھی اور اس وجہ سے لوگ ایک دوسرے کو اپنی سواری مستعار دینے میں کوئی تکلیف محسوس نہیں کرتے تھے‘ اس کی انشورنس بھی نہیں کرائی جاتی تھی‘ اس میں پٹرول ڈلوانے کی ضرورت بھی نہیں تھی‘ اردگرد موجود زرعی زمینوں اور چراگاہوں سے اس کی خوراک کا بندوبست ہوجاتا تھا۔ اس سواری کا سفر اتنا سستا تھا کہ اس پر بیٹھ کر امام بخاریؒ نے کئی ممالک کا سفر کیا۔ اگر یہ سواری ضائع ہوجاتی تو دوسری سواری خریدنا ناممکن نہیں ہوتا تھا‘ اگر سواری میں کوئی نقص پیدا ہوجاتا تو اس کو ذبح کرکے کھالیا جاتا۔ یہ سواری کسی قسم کی ماحولیاتی آلودگی کا باعث نہیں تھی اور اس کا گوبر تک کھاد کے کام آتا تھا۔ اس سواری کی دیکھ بھال کے لیے بڑے بڑے ورکشاپ کھولنے کی ضرورت بھی نہیں پڑی‘ جہاں بیٹھے ہوئے کارندے لوگوں کو بیوقوف بناتے ہوں۔ مالک اس سواری کے کل پُرزوں کو اور طریقہ کار کو جان سکتا تھا اور جانتا تھا اور وہ اس کی خوبیوں‘ خرابیوں سے واقف ہوتا تھا۔ اس کو درست کرنے اور درست رکھنے کے لیے اسے سات سمندر پار سے ماہرین‘ بروشر‘ ٹیکنالوجی ایکسپرٹ اور ہزاروں قسم کے ماہرین کی ضرورت نہ تھی۔ پھر اس سواری کا سب سے بڑا فائدہ انسان کا صحت مند وجود تھا۔ گھوڑے کی پیٹھ پر پندرہ کلومیٹر سفر کرنے کے بعد نہ کسی کو حملۂ قلب ہوتا تھا اور نہ بلڈ پریشر بڑھتا تھا‘ نہ شوگر ہوتی تھی‘ نہ سونے کے لیے نیند کی گولیاں کھانی پڑتی تھیں اور نہ جسم میں طرح طرح کے درد نکلتے تھے جو آج کل کے پیٹ بھروں اور آرام پسندوں کو لاحق ہوگئے ہیں —— بتایئے کیا سائنس وٹیکنالوجی کے ماہرین ان معیارات پر کار کا موازنہ گھوڑے اور اونٹ گاڑی سے کرنے کے لیے تیار ہوں گے؟‘‘

اس گفتگو سے مقصود یہ ہے کہ خود ترقی کے مادی معیارات بھی مختلف ہوتے ہیں اور ترقی ماپنے کا کوئی عالمگیر پیمانہ نہیں ہے۔ لیکن کسی بھی پیمانے پر ترقی انسان کا مقصودِ حیات بن جائے یا فوز وفلاح کی میزان بن جائے اور نجات وہدایت کے مقصدِ حیات کو بھلا دے تو تباہی اور گمراہی اس کا مقدّر بن جاتی ہے۔ آج بالعموم پوری انسانیت اسی جہالت کے گڑھے میں دھنستی جارہی ہیں جہاں اس نے نجات وہدایت کی بجائے ترقی ومادیت کو اپنا مقصود قرار دے لیا ہے

اور اسی کو کامیابی کی راہ سمجھ لیا ہے' جبکہ اسلام کے نزدیک مادی ترقی یا مادی انحطاط کا حقیقی کامیابی سے کوئی تعلق نہیں۔ پرانے زمانے میں بھی کئی قومیں ایسی گزری ہیں جنہوں نے تمدّن' بودوباش اور عمارت سازی میں بہت ترقی کر لی تھی۔ اس مادی ترقی اور اس پر ان کے گھمنڈ کا تذکرہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَقَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَهُمْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً ۭ﴾ (حٰمٓ السجدۃ:۱۵)

''(قومِ) عاد کا حال یہ تھا کہ وہ زمین میں کسی حق کے بغیر بڑے بن بیٹھے تھے اور کہنے لگے ''کون ہے ہم سے زیادہ زور آور۔ ان کو یہ نہ سوجھا کہ اللہ تعالیٰ جس نے ان کو پیدا کیا ہے وہ ان سے زیادہ زور آور ہے۔''

اسی طرح فراعنۂ مصر اور قارون کا حال قرآن مجید نے بیان کیا ہے۔ فراعنۂ مصر کے دور کی ترقی کا حال تو آج بھی اہرامِ مصر سنا رہے ہیں' لیکن فرعون اور قارون اپنی جاہ وحشمت سمیت غرقِ آب کر دیے گئے' زمین میں دھنسا دیے گئے اور آخرت میں جہنم کا ایندھن بنا دیے گئے۔ یوں مادی ترقی اُن کی لیے فوز وفلاح کا سبب نہ بن سکی' نہ دنیا میں اور نہ ہی آخرت میں۔

ان کے مقابلے میں قرآن مجید اصحابِ کہف اور اصحابُ الاخدود کے واقعات سناتا ہے جو اس دنیا میں تو 'ترقی' کی راہ پر گامزن نہ تھے بلکہ اپنے معاشرے اور حکمرانوں کے زیرِ عتاب رہے لیکن آخرت میں حقیقی فوز وفلاح سے ہم کنار ہوئے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں حق بات کو سمجھنے اور اپنانے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَهٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَهٗ (آمین)

## حواشی

(۱) صحیح مسلم' کتاب البر والصلة والآداب' باب فضل الضعفاء و الخاملین۔

(۲) صحیح مسلم' کتاب الامارة' باب بیان قدرثواب من غزا فغنم و من لم یغنم۔

❁❁❁

میثاق' حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔

# ہندومت اور اسلام میں عورت کے پردے کا موازنہ

ڈاکٹر گوہر مشتاق، کیلیفورنیا (امریکہ)

عربی زبان کا محاورہ ہے: تُعْرَفُ الْاَشْیَاءُ بِاَضْدَادِھَا ''چیزیں اپنی ضد (opposites) سے پہچانی جاتی ہیں''۔ یہ خصوصیت ہمیں قرآن میں بھی نظر آتی ہے۔ اسی لیے قرآن کا ایک نام ''الفرقان'' ہے، یعنی حق اور باطل میں فرق کرنے والی کتاب۔ قرآن حکیم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۣ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ﴾ (البقرۃ:۲۵۶)

''دینِ اسلام میں زبردستی نہیں ہے، ہدایت صاف طور پر ظاہر اور گمراہی سے الگ ہو چکی ہے۔''

اسی حقیقت کو جاپانی مستشرق پروفیسر آئی زٹسو (Toshihiko Izutsu) نے اپنی کتاب ''Ethico-Religious Concepts in the Quran'' (مطبوعہ کینیڈا، ۲۰۰۲ء) میں بیان کیا ہے۔ ٹوکیو کی کیو یونیورسٹی (Keio University) کے اس محقق نے قرآن پر سالہا سال کی تحقیق کے بعد یہ انکشاف کیا کہ قرآن میں (برخلاف دوسری مذہبی کتابوں کے) مقابل نظریات (Theme of Opposites) اور ان کو روبرو پیش کرنے کا موضوع بہت عام ہے۔ مثلاً قرآن ''کافر'' کے مقابلے میں ''مؤمن'' کا لفظ استعمال کرتا ہے جو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ''کافر'' وہ ہیں جنہوں نے ''باطل'' کو اپنایا اور ''مؤمن'' وہ ہیں جنہوں نے ''حق'' اختیار کیا۔ ''مسلمین'' کے مقابلے میں قرآن ''مجرمین'' کو اُن کی ضد کے طور پر لاتا ہے۔ اسی طرح ''اصحاب الجنۃ'' کی ضد کے لیے ''اصحاب النار'' کی اصطلاح قرآن استعمال کرتا ہے تاکہ موازنہ آسان ہو جائے۔

قرآن کے اسی انداز کے پیشِ نظر اس مضمون کا موضوع ہندومت اور اسلام میں عورتوں



کے پردے کے احکامات کا موازنہ کرنا ہے تاکہ ہمیں اسلامی پردے کی اہمیت سمجھ میں آسکے اور اندازہ ہو سکے کہ اسلام کس طرح انسان کی فطرت کے عین مطابق ہے اور جو مقام اسلام نے عورت کو دیا ہے وہ کسی مذہب نے نہیں دیا۔ اس کی ایک وجہ دیگر مذاہب کے احکامات میں وقت کے ساتھ انسانی تحریف ہے جس سے قرآن قیامت تک کے لیے محفوظ ہے۔

موجودہ دور کے جدیدیت پسند، مغرب زدہ اور روشن خیال مسلمانوں کا ایک طریقۂ واردات یہ ہے کہ اسلام کا جو حکم انہیں پسند نہ ہو اسے وہ اسلام سے قبل دور کا عرب کلچر یا پرانی تہذیبوں کے رسم ورواج کہہ کر اس حکم سے جان بخشی کروانے کی کوشش کرتے ہیں، مثلاً داڑھی، موسیقی اور پردہ۔ اس مضمون کا ایک مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ اسلام کے احکامات دوسرے مذاہب کی تعلیمات سے یکسر مختلف ہیں، کیونکہ اسلامی احکامات میں انسانوں نے تبدیلیاں نہیں کیں جبکہ دوسرے مذاہب کی تعلیمات کا حلیہ بعد کے ادوار میں بدل گیا۔

## ہندومت اور اسلام میں عورت کے مجموعی مقام کا تجزیہ

ہندومت میں عورت کی حیثیت ہمیشہ افراط وتفریط کا شکار رہی۔ منوجی کی تعلیم تو یہ تھی کہ:

''جہاں عورتوں کی عزت نہیں ہوتی وہاں ایک صالح معاشرہ قائم نہیں ہو سکتا۔''(۱)

لیکن وقت کے ساتھ ساتھ مذہب کی صحیح روح باقی نہ رہنے اور برہمنوں کی مذہبی کتابوں میں تحریف کی وجہ سے ہندو عورت مظلوم ہوتی چلی گئی۔ ان کی مذہبی کتاب کے مطابق:

''عورت لڑکپن میں اپنے باپ کے اختیار میں رہے، جوانی میں شوہر کے اختیار میں، اور بیوہ ہونے کے بعد اپنے بیٹوں کے اختیار میں رہے، خودمختار ہو کر کبھی نہ رہے۔''(۲)

اسی طرح دوسری جگہ لکھا ہے:

''عورت کے لیے قربانی اور برت (روزہ) کرنا گناہ ہے، صرف شوہر کی خدمت کرنا چاہیے۔ عورت کو چاہیے کہ شوہر کے مرنے کے بعد دوسرے شوہر کا نام بھی نہ لیوے، کم خوراکی کے ساتھ اپنی زندگی کے دن پورے کرے۔''(۳)

نہ صرف یہ بلکہ اسے شوہر کے مرنے کے بعد اس کی چِتا پر ستی ہو جانے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ اس کو ملکیت اور وراثت کے حقوق سے محروم رکھا جاتا ہے۔

اس کے برعکس اسلام نے عورت کو ایک مقدس ہستی کے طور پر بلند مقام عطا کیا۔ بہنوں اور بیٹیوں کی پرورش کو جنت کی کنجی قرار دیا، جیسا کہ حدیث میں ارشاد ہے:

((مَنْ عَالَ ثَلَاثَ بَنَاتٍ فَاَدَّبَھُنَّ وَزَوَّجَھُنَّ وَاَحْسَنَ اِلَیْھِنَّ فَلَہُ الْجَنَّۃُ)) (۴)

''جس نے تین بیٹیوں (ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: تین بیٹیوں یا تین بہنوں یا دو بہنوں یا دو بیٹیوں) کی پرورش کی' انہیں ادب وسلیقہ سکھایا' اُن سے اچھا برتاؤ کیا اور ان کی شادی کر دی تو اس کے لیے جنت ہے۔''

اسلام نے ماں کے درجے کو باپ سے بھی بلند کیا۔ بیواؤں کو نہ صرف دوسری شادی کا حق عطا کیا بلکہ معاشرے کی بیواؤں اور یتیموں کے بارے میں کہا کہ ہمیں رزق انہی کے وجود کی برکت سے ملتا ہے اور ہماری خوشحالی انہی لوگوں کے وسیلے سے ہے۔

((هَلْ تُنْصَرُوْنَ وَتُرْزَقُوْنَ اِلَّا بِضُعَفَائِكُمْ)) (۵)

''تمہیں فتح اور رزق صرف تمہارے کمزور لوگوں (بیواؤں' مسکینوں) کی وجہ سے ملتا ہے۔''

تاریخ انسانی میں پہلی مرتبہ اسلام نے عورت کو ایک مکمل شخصیت عطا کی۔ قرآن نے اعلان کیا کہ میاں بیوی ایک دوسرے کے لیے ''لباس'' کی طرح ہیں۔ فرمایا: ﴿هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ﴾ (البقرۃ:۱۸۷) ڈاکٹر چیٹر جی (Chatterjee) (ایم اے' پی ایچ ڈی' امریکہ) ایک روشن خیال ہندو ہیں۔ انہوں نے اپنی مشہور کتاب ''Oh! You Hindu Awake!'' (مطبوعہ مدراس انڈیا پبلیکیشنز' کلکتہ) میں اپنے ہندو ہم وطنوں کو مخاطب کر کے اسلام کی عظمت کا ان الفاظ میں اعتراف کیا ہے:

''مسلمان عورتوں کے حقوق ہر معاملے میں مسلمان مَردوں کے برابر ہیں' حتیٰ کہ طلاق کے معاملے میں بھی۔ مزید برآں مسلمانوں کے قرآن کے مطابق گو کہ طلاق کی اجازت ہے لیکن یہ ناپسندیدہ عمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں طلاق کی شرح پوری دنیا میں سب سے کم ہے۔''

## ہندومت اور اسلام میں پردے کا موازنہ

پچھلے چند سالوں میں یورپ اور امریکہ کے بعض عمرانی سائنسدانوں (Social Scientists) اور علم انسان کے ماہرین (Anthropologists) خواتین نے انڈیا کے دیہاتوں اور شہروں میں جا کر ہندوؤں میں مروّج مذہبی پردے کا کئی سالوں تک مطالعہ (study) کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے انڈیا اور پاکستان کی مسلمان خواتین کے پردے کو بھی قریب سے سمجھنے کی کوشش کی۔ ان مغربی محققین میں یورنیورسٹی آف شکاگو کی خاتون عمرانی سائنسدان حنا پاپانک (Hanna Papanek)' جان ہونگمین (John J. Honigmann)'



ڈبلیو ایل سلوکم (W.L.Slocum)' یونیورسٹی آف کیل (University of Keele) کی ماہرِ علمِ انسان ارسولا شرما (Ursula M.Sharma) وغیرہ شامل ہیں۔ اسلام میں خواتین کے پردے کے احکامات تو واضح طور پر سورۃ النور' سورۃ الاحزاب اور احادیثِ نبویہؐ میں مل جاتے ہیں' البتہ ہندوؤں میں رائج مذہبی پردے کے احکامات کو سمجھنے کے سلسلے میں ان مغربی عمرانی سائنس دانوں کی تحقیقات بہت کارآمد ہیں۔ ذیل میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں خواتین کے پردے کا موازنہ پیش کیا جاتا ہے۔

## (۱) خواتین کے پردے کی بنیاد

ہندوؤں میں خواتین کے پردے کی بنیاد چند اجتنابی قوانین (Avoidence Rules) ہیں جو کہ عورت اور اس کے مرد رشتہ داروں کے درمیان ہوتے ہیں' جبکہ مسلمانوں میں پردے کے احکامات (بالخصوص چہرے کے پردے سے متعلق) عورت کے قریب ترین رشتہ داروں پر منطبق (apply) نہیں ہوتے بلکہ نامحرموں سے متعلق ہوتے ہیں۔

## (۲) پردہ شروع کرنے کی عمر

ہندومت میں خواتین کے لیے پردہ شادی کے بعد لازم ہوتا ہے' اس کے برعکس اسلام میں پردہ بالغ ہونے کے بعد شروع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ غیر شادی شدہ نوجوان مسلمان لڑکیاں غیر مَحرم مَردوں سے پردہ کرتی ہیں۔

## (۳) پردہ کرنے کی ایک بنیادی وجہ

ہندو مذہب میں عورت کے لیے پردے کا تعلق جائنٹ فیملی سسٹم میں رہتے ہوئے اپنے خاوند کے خاندان کے مردوں کا احترام ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں مسلمان خواتین کے لیے پردہ دراصل اپنے قریب ترین مرد رشتہ داروں (باپ' بھائی' بھتیجا' بیٹا وغیرہ) سے خونی رشتوں کی اہمیت کو اُجاگر کرتا ہے' کیونکہ وہ اس عورت کے محرم ہیں جن سے وہ پردہ نہیں کرتی' جبکہ پردہ صرف نامحرموں سے کیا جاتا ہے۔

## (۴) کن جگہوں پر پردہ کرنا لازمی ہوتا ہے؟

ہندومت میں عورت اپنے خاوند کے گھر میں گھونگھٹ کے ذریعے اپنے خاوند کے مرد رشتہ داروں سے چہرے کا پردہ کرتی ہے۔ امریکہ کی شکاگو یونیورسٹی کے سوشیالوجی کے شعبے کی

خاتون محقق حنا پاپانک کی تحقیق کے مطابق ہندو خواتین کے لیے اپنے خاوند کے دیہات میں تمام مردوں سے چہرے کا پردہ لازم ہوتا ہے' جبکہ اپنے والدین کے گاؤں میں کسی مرد سے پردہ کرنا اس پر لازم نہیں (۶) حنا پاپانک نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ہندومت کے برعکس مسلمان خواتین قرآن میں محرم مردوں کی دی گئی لسٹ کے علاوہ تمام نامحرم مردوں سے چہرے کا پردہ کرتی ہیں (۷)

## (۵) شوہر کے کن رشتہ داروں سے پردہ کرنے کا حکم ہے؟

ہندوؤں میں مروّج مذہبی پردے کے مطابق عورت اپنے شوہر کے گھرانے میں اپنے شوہر سے بڑی عمر کے ہر مرد سے پردہ کرتی ہے' لیکن اپنے شوہر سے کم عمر کے مردوں کے سامنے وہ گھونگھٹ نہیں نکالتی۔ مثلاً وہ اپنے سسر کو اپنا چہرہ نہیں دکھاتی' اسی طرح اپنے جیٹھ سے بھی وہ پردہ کرتی ہے' لیکن اپنے دیور سے پردہ کرنا اس پر لازم نہیں ہے۔ برطانیہ کی کیل یونیورسٹی کی عمرانی سائنس دان خاتون ارسولا شرما اپنی تحقیق جو سائنسی جریدے Royal Anthropological Institute of Great Britain and Ireland کے ۱۹۷۸ء کے شمارے میں (جلد ۱۳' صفحات ۲۳۳۔۲۱۸) چھپی' لکھتی ہے:

''ہندو عورت کا اپنے دیور سے نہایت بے تکلفانہ (informal relationship) ہوتا ہے جو کبھی کبھی کچھ زیادہ ہی بے تکلّفانہ ہو جاتا ہے..... ہندو خاتون کا اپنے دیور سے جو رویّہ ہوتا ہے وہ اس کے جیٹھ یا خاوند سے بڑے دوسرے رشتہ داروں کے مقابلے میں بالکل اُلٹ ہوتا ہے جن سے اس نے لازمی پردہ کرنا ہوتا ہے۔''

اس کے مقابلے میں اسلامی تعلیمات کے مطابق عورت اُن تمام مردوں سے پردہ کرتی ہے جو نامحرم ہیں' چاہے ان کی عمر اس کے خاوند سے زیادہ ہو یا کم (شرط صرف یہ ہے کہ نامحرم مرد بالغ ہوں)۔ عورت کا سسر اور سوتیلے جوان بیٹے اُس کے محرم ہیں' جبکہ خاوند کے بھائی' کزن' بھتیجے' انکل وغیرہ سب نامحرم ہیں' چاہے وہ اس کے خاوند سے عمر میں چھوٹے ہوں۔

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اِيَّاكُمْ وَالدُّخُوْلَ عَلَى النِّسَاءِ)) فَقَالَ رَجُلٌ مِّنَ الْاَنْصَارِ :يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اَفَرَاَيْتَ الْحَمْوَ؟ قَالَ :((اَلْحَمْوُ الْمَوْتُ)) (۸)

''عورتوں کے پاس تنہائی میں جانے سے بچو!'' انصار میں سے ایک شخص نے کہا:



یارسول اللہ! حمو کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے (یعنی عورت کے دیور' جیٹھ' خاوند کے جوان بھتیجے' بھانجے وغیرہ)؟ آپؐ نے فرمایا: ''حمو تو عورت کے لیے موت ہے۔''

اس حدیث کی تشریح میں امام نوویؒ فرماتے ہیں:

''اللیث بن سعد کی رائے یہ ہے کہ حمو سے مراد عورت کے سسر اور سوتیلے بیٹوں کے علاوہ خاوند کے باقی تمام مرد رشتہ دار ہیں جن سے زندگی کے کسی بھی حصہ میں طلاق یا بیوگی کی صورت میں عورت کی شادی ہو سکتی ہے۔'' (۹)

حدیث کے الفاظ ''حمو تو موت ہے'' کی شرح کرتے ہوئے علامہ ابن اثیرؒ فرماتے ہیں:

''یہ عربی زبان کا انداز ہے' جیسے ہم کہیں ''شیر تو موت ہے'' یا ''بادشاہ تو آگ ہے'' جس کا مطلب یہ ہوگا کہ شیر سے ملاقات کا مطلب موت کو دعوت دینا ہے یا بادشاہ کا مقابلہ کرنا آگ میں جانے کے مترادف ہے۔ بس عورت اور اس کے خاوند کے نامحرم رشتہ دار کا تنہائی میں ہونا اس سے زیادہ خطرناک ہے کہ کوئی اجنبی مرد ہو۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ عورت کو اس کے خاوند کا رشتہ دار اس کے خاوند کے خلاف بھڑکائے یا کوئی اور قسم کی غلط فہمیاں پیدا کرے جو فتنہ اور فساد کا موجب بنیں۔''

## (۶) پردہ اور عورت کی ذات پات

محققہ ارسولا شرما کی تحقیق کے مطابق برہمن عورت کے لیے نچلی ذات کے مرد سے چہرے کا پردہ کرنا لازمی نہیں ہوتا چاہے وہ اس کے خاوند کا قصبہ ہی کیوں نہ ہو' لیکن نچلی ذات کی عورت (مثلاً چمار' شودر وغیرہ) کے لیے لازم ہے کہ وہ اُس برہمن مرد سے پردہ کریں جو اس کے خاوند کی عمر یا اس سے زیادہ عمر کا ہے۔ اس لیے نچلی ذات کی عورتیں اپنے سے اونچی تمام ذاتوں کے تمام بڑی عمر کے مَردوں سے دیہات میں چہرے کا پردہ کرتی ہیں۔ (۱۰)

اس کے برعکس اسلام میں ذات پات کا سِرے سے کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ ایک مسلمان عورت کو ہر نامحرم مرد سے پردہ کرنے کا حکم ہے' چاہے وہ مرد امیر ہو یا غریب۔

## (۷) پردہ اور معاشرہ

ہندو مذہب کا ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اُس میں عورت کو نچلے درجے کی مخلوق سمجھا جاتا ہے' اس لیے اُن کی مذہبی کتابوں میں عورت کے پردے کے سلسلے میں بہت کم احکامات ملتے ہیں۔ آج ہندومت میں عورت کے پردے کے جو احکامات بگڑی ہوئی شکل میں ملتے بھی ہیں تو وہ

دراصل ویدک دور کے ہیں جب عورت کی عزت تھی اور اس کو کمتر مخلوق نہیں سمجھا جاتا تھا جیسی وہ منوشاستر میں دکھائی گئی ہے۔ وید میں عورتوں کا ذکر ہمیشہ تعظیم کے ساتھ ہوا ہے۔(۱۱)

مغربی مؤرخ ہنٹر (Hunter) اپنی کتاب ''تاریخِ اہلِ ہند'' میں ویدک دور کے متعلق لکھتا ہے:

''ویدک دور میں نکاح متبرک سمجھا جاتا تھا' بیوی کا مرتبہ گھر کے انتظام میں مساوی تھا' سَتی کی رسم سے کوئی واقف نہ تھا۔ وید کے وہ اَشلوک جن سے برہمنوں نے تاویل کر کے اس رسم کو جائز ٹھہرایا ہے' اُس کے خلاف معنی رکھتے ہیں۔''

جب ہندومت میں مذہبی کتابوں میں تحریف کر کے عورتوں کے مقام کو کم کیا گیا تو اس کے لامحالہ اثرات اُن کے مذہبی پردے کے احکامات پر بھی پڑے۔ مثلاً بیوہ عورت کے ساتھ بدقسمتی کا تصور وابستہ کر دیا گیا اور اس کو منحوس سمجھا جانے لگا۔ وہ سماجی اور مذہبی تقاریب میں حصہ نہیں لے سکتی' اس لیے کہ اس کی منحوسیّت دوسروں کو نہ لگ جائے۔ ایسے حالات میں وہ غریب گھر سے باہر پردے کا کیا سوچے گی۔ اسی طرح لڑکی کا شادی سے پہلے پردہ نہ کرنا یا شادی کے بعد صرف اپنے خاوند کے قصبے میں پردہ کرنا' جبکہ اپنے قصبے میں مردوں سے پردہ نہ کرنا وغیرہ ایسی تعلیمات ہیں جن کی بنا پر یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ہندو مذہب میں عورت کے گھر سے باہر کے پردے کے متعلق کیا احکامات ہیں۔

اس کے برعکس اسلام اپنے پیروکاروں کو ہر شعبے میں مکمل نظامِ حیات مہیا کرتا ہے۔ اسلام عورتوں کے گھر سے باہر نکلنے پر پابندی عائد نہیں کرتا۔ اسلام عورت کو پردے کی حدود میں رہتے ہوئے ضرورت کے تحت باہر نکلنے کی اجازت دیتا ہے' البتہ معاشرے میں جہاں کہیں عورتوں مردوں کے اختلاط اور فتنے کا ذرہ برابر بھی اندیشہ ہو وہاں اسلام ڈھیل دینا برداشت نہیں کرتا۔ یہاں پر اس سلسلے میں اسلام کے چند احکامات بیان کیے جاتے ہیں۔

سورۃ النور میں اللہ تعالیٰ نے مؤمن مَردوں اور عورتوں کو حکم دیا کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی عفت کی حفاظت کریں:

﴿قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ۭ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ۝۳۰ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ﴾ (النور:۳۱)



''(اے محمد ﷺ) آپ مؤمن مردوں اور مؤمن عورتوں سے کہہ دیجیے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔''

اسی طرح ﴿وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى﴾ (بنی اسراء یل:۳۲) ''اور بدکاری کے قریب بھی مت جاؤ'' کے قرآنی حکم کے تحت ہر وہ دروازہ بند کر دیا گیا جو انسان کو بُرائی کی طرف اُبھارے۔ سورۃ الاحزاب میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔـلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَاۗءِ حِجَابٍ ۭ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَقُلُوْبِهِنَّ ۭ﴾ (آیت ۵۳)

''اگر تم (مردوں) کو کچھ مانگنا ہو تو عورتوں سے پردے کے پیچھے سے مانگا کرو' یہ تمہارے اور ان کے دلوں کی پاکیزگی کے لیے زیادہ مناسب طریقہ ہے۔''

اگرچہ یہ حکم اوّل اوّل ازواجِ مطہّرات کے لیے نازل ہوا تھا اور اس حکم کے بعد ازواجِ مطہّرات کے گھروں میں دروازوں پر پردے لٹکا دیے گئے تھے' لیکن چونکہ حضور اکرم ﷺ کا گھر تمام مسلمانوں کے لیے نمونے کا گھر ہے اس لیے تمام مسلمانوں کے گھروں پر بھی پردے لٹک گئے۔ آیت کے آخری فقرے میں اس بات کا واضح اشارہ ہے کہ جو لوگ بھی مردوں اور عورتوں کے دل پاک رکھنا چاہتے ہیں انہیں یہ طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔

قرآن حکیم نے مسلمان عورتوں کو نامحرم مَردوں سے پَردے کے پیچھے سے گفتگو کرنے کا طریقہ بھی واضح کر دیا:

﴿فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝۳۲﴾ (الاحزاب)

''مردوں سے تم دبی زبان (یعنی نرم لہجے) سے بات نہ کرو کہ جس شخص کے دل میں کوئی خرابی ہے وہ تم سے کچھ توقعات وابستہ کر بیٹھے بلکہ صاف سیدھی بات کرو۔''

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''کوئی شخص کسی نامحرم عورت کے پاس مت داخل ہو سوائے اس کے کہ اس شخص کے ساتھ ایک یا دو مرد ہوں۔'' (۱۲)

گھر سے باہر کے پردے سے متعلق نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((مَثَلُ الرَّافِلَةِ فِي الزِّيْنَةِ فِيْ غَيْرِ اَهْلِهَا كَمَثَلِ ظُلْمَةِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَا نُوْرَ

لَهَا)) (۱۳)

''اجنبی مَردوں میں زینت کے ساتھ (ناز وانداز سے) چلنے والی عورت ایسی ہے جیسے روزِ قیامت کی تاریکی کہ اس میں کوئی نور نہیں۔''

مسلمان عورتوں کو خوشبو لگا کر باہر نکلنے سے منع کیا گیا ہے (بحوالہ مسند احمد و ترمذی) اسی طرح مسجدوں میں عورتوں کے لیے بہترین صفیں سب سے پچھلی صفیں قرار دی گئیں جو مردوں کی صفوں سے نہایت دور ہوتی ہیں (بحوالہ صحیح مسلم) یعنی نماز جیسی مقدس محفل میں بھی عورتوں اور مردوں کی مخلوط محفل کی اجازت نہیں دی گئی تو باقی حالات میں اسلام کیسے مخلوط محفلوں کی اجازت دے سکتا ہے' چاہے وہ مخلوط تعلیم ہو' یا مخلوط نوکریاں' مخلوط سواریاں ہوں یا پارکوں' تفریح گاہوں اور قہوہ خانوں (Restaurants) وغیرہ میں مرد وزن کے اختلاط کی وجہ سے بے پردگی ہو' اسلام ان کی کسی صورت اجازت نہیں دیتا۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے حضور ﷺ کے ساتھ عید کی نماز پڑھی اور نماز کے بعد آپؐ نے خطبہ دیا:

ثُمَّ اَتَى النِّسَاءَ وَمَعَهٗ بِلَالٌ فَوَعَظَهُنَّ وَذَكَّرَهُنَّ وَاَمَرَهُنَّ بِالصَّدَقَةِ (۱۴)

''پھر حضور ﷺ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے ہمراہ عورتوں کی طرف گئے اور انہیں (ایک علیحدہ خطبہ دیا جس میں انہیں) وعظ و نصیحت کی اور صدقے کی ترغیب دی۔''

علامہ ابن حجر عسقلانیؒ اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں:

''اس حدیث میں بیان ہوا ہے کہ رسول اللہ ﷺ عورتوں کی طرف علیحدہ گئے جس سے پتا چلتا ہے کہ وہاں عورتوں کا اجتماع مردوں سے علیحدہ تھا اور وہ مخلوط اجتماع نہ تھا۔''(۱۵)

سنن ابی داؤد کی حدیث میں بیان ہوا ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے مسجد کے باہر بھیڑ میں مردوں اور عورتوں کا اختلاط (mixing together) دیکھا تو آپؐ نے عورتوں سے فرمایا کہ وہ گلیوں کے درمیان میں نہ چلیں بلکہ کناروں پر چلیں تاکہ مردوں سے بھیڑ کی وجہ سے ٹکراؤ نہ ہو۔ مزید برآں' مسلمان مردوں کو جنازے میں شرکت کی ترغیب دی گئی ہے لیکن عورتوں کو مردوں سے اختلاط سے بچنے کی خاطر شرکتِ جنازات سے منع کیا گیا ہے۔

علمائے اسلام اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے۔ مثلاً عظیم حنفی عالم امام سرخسیؒ اپنی معرکۃ الآراء کتاب ''المبسوط'' میں لکھتے ہیں:



''مسلمان قاضی کو چاہیے کہ وہ عورتوں کے بیان مردوں سے علیحدہ لے کیونکہ عدالتوں میں لوگوں کا ہجوم ہو جاتا ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ ایسی بھیڑ والی جگہ میں مردوں اور عورتوں کے اختلاط سے بہت سے فتنے جنم لیتے ہیں اور بُرے نتائج سامنے آتے ہیں۔''(۱۶)

محدّث امام شرف الدین نوویؒ لکھتے ہیں:

''آج کل کے دور کی ایک نہایت بری بدعت جس میں چند جاہل لوگ ملوث ہیں وہ عادت ہے کہ چاند کی نویں تاریخ کو یہ لوگ جبلِ عرفات پر جا کر موم بتیاں جلاتے ہیں۔ یہ نہایت گمراہ کن فعل ہے اور اس میں بہت سی برائیاں جمع ہیں' مثلاً مردوں اور عورتوں کا آزادانہ اختلاط۔''(۱۷)

اسی طرح اسلامی فقہ کی کتاب ''الفواکہ الدیوانی'' کے ایک باب میں یہ بحث کی گئی ہے کہ شادی کی دعوت سے کن حالات میں انکار کیا جا سکتا ہے۔ اس میں لکھا ہے:

''شادی کی دعوت سے اس صورت میں انکار کیا جا سکتا ہے جب شادی کی تقریب میں کوئی واضح برائی ہو رہی ہو' مثلاً عورتوں اور مردوں کا آزادانہ اختلاط (یعنی عورتوں کا مردوں کے سامنے بے پردہ ہونا)۔''

## پردہ اور حیا — اسلامی تہذیب کا خاصہ

حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اِنَّ لِكُلِّ دِيْنٍ خُلُقًا وَخُلُقُ الْاِسْلَامِ الْحَيَاءُ)) (۱۸)

''ہر دین کا ایک اخلاق ہوتا ہے اور اسلام کا اخلاق حیا ہے۔''

اس حدیث مبارکہ میں حضور ﷺ نے اسلامی تہذیب کی سب سے بڑی خصوصیت ''شرم و حیا'' بتائی ہے۔ لفظ ''حیاء'' کا مادہ قدیم عربی زبان میں ''حیات'' ہے جس کا مطلب ''زندگی'' ہے' یعنی اُمتِ مسلمہ کی زندگی ہی ''شرم و حیا'' سے ہے۔ شرم و حیا مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبے میں عیاں ہوتی ہے۔ خواتین کا پردہ اس کے اظہار کی ایک صورت ہے۔ مسلمانوں کے بنائے ہوئے گھر اور عمارات یعنی فنِ تعمیر بھی اسی ''حیا'' کی غمازی کرتا ہے۔ مغربی ماہرینِ علمِ الانسان (Anthropologists) اور ماہرینِ علمِ عمرانیات (Sociologists) مسلمانوں کی طرزِ زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں تو انہیں ہندوانہ یا مغربی طرزِ زندگی واضح طور پر اسلامی طرزِ زندگی سے مختلف نظر آتی ہے۔ حنا پاپانک برصغیر میں مسلمانوں کے فنِ تعمیر کے متعلق لکھتی ہے:

''مڈل کلاس اور امیر خاندانوں میں گھروں کے زنانہ حصے کے لیے علیحدہ دروازہ ہوتا

ہے۔ مسلمانوں کے فنِ تعمیر کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ گھروں کی کھڑکیوں اور بالکونیوں پر پردے لگے ہوتے ہیں۔ گھروں کے اندر لٹکے ہوئے پردوں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ گھر میں آنے والے مرد مہمانوں کی نگاہ گھر کی عورتوں پر نہ پڑے۔'' (۱۹)

اسی طرح امریکی سوشیالوجسٹ جان جے ہونگمین (John.J.Honigmann) اسلامی معاشروں کی طرزِ زندگی کے متعلق لکھتا ہے:

''پبلک جگہیں اکثر اوقات ہر طرف سے بند اور محفوظ ہوتی ہیں تاکہ باپردہ عورتیں ان میں آسانی سے چل پھر سکیں۔ سواریوں میں پردے لگے ہوتے ہیں اور بسوں اور ٹرینوں میں عورتوں کے لیے علیحدہ کمپارٹمنٹ بنے ہوتے ہیں۔ کئی کوایجوکیشنل سکولوں میں لڑکوں اور لڑکیوں کو علیحدہ کرنے کے لیے پردے استعمال کیے جاتے ہیں۔'' (۲۰)

## پردہ اور مسلمان عورتوں میں خود اعتمادی

اسلام کا نظامِ عفت و عصمت غیر مسلم معاشروں سے بہت مختلف ہے۔ اس حقیقت کو بعض ماڈرنسٹ مسلم خواتین نے بھی تسلیم کیا ہے۔ آسیہ جی بار' جو الجزائر کی نامور ناول نگار' مترجم اور فلم کار (film maker) ہے' تحریک نسواں کی علمبردار ہے' لیکن اپنی کتاب ''Women of Islam'' (مطبوعہ لندن' ۱۹۶۱ء) میں اسلام کے دفاع میں لکھتی ہے:

''مغربی دنیا میں باہر کی پبلک زندگی پر زیادہ زور دیا جاتا ہے' لیکن ایک مسلمان کے لیے اُس کے گھر کے اندر کی فیملی کی زندگی سب سے زیادہ اہم ہے۔ لفظ ''حرم'' جس کو مغربی دنیا میں خوب بدنام کیا گیا' وہ ہمارے ہاں بہت مقدس مقام رکھتا ہے۔ ''حرم'' ایک ایسی جگہ ہے جہاں مسلمان مرد اپنی مقدس اور عزیز ترین متاع کو رکھتا ہے یعنی اُس کی بیوی..... اور موجودہ دور کا سب سے بڑا المیہ ہی خاندانی نظام کی ناگفتہ بہ حالت ہے جن کے اندر کے پرانے قبائلی ڈھانچے ٹوٹ گئے ہیں۔ خاندانی نظام کا مرکز عورت ہوتی ہے اس لیے وہی اس طوفان کا سب سے زیادہ شکار ہوئی ہے۔''

یہ صحیح ہے کہ مغرب سے آئے ہوئے عورتوں کی بے پردگی کے سیلاب نے مسلمانوں کے خاندانی نظام کو ہلا کر رکھ دیا ہے' لیکن دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ موجودہ دور میں پوری دنیا میں اسلامی بیداری کی لہر کے نتیجے میں مسلمان لڑکیوں اور خواتین نے اسلامی پردے کے ثمرات کو سمجھا اور اپنی مرضی سے اسلامی پردہ اختیار کیا ہے۔ مسلمان ممالک بلکہ مغربی



ممالک میں بھی میڈیا کے ذریعے اسلام کے خلاف بھرپور پراپیگنڈا کے باوجود برقعے اور نقاب میں ملبوس خواتین کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ حال ہی میں امریکہ مشی گن سٹیٹ یونیورسٹی کے شعبۂ عمرانیات کی محقق خاتون فلارنس میکارتھی (Florence McCarthy) نے بنگلہ دیش کے قصبوں کی مسلمان خواتین پر تحقیق کی۔ اُس نے وہاں پر یہ مشاہدہ کیا کہ برقعہ اور شرعی پردے پر عمل درآمد وہاں پر عام ہے۔ بہت سی خواتین نے سروے میں فلارنس کو بتایا کہ انہیں یاد ہے کہ برقعہ اُن کی زندگی ہی میں مقبول ہوا (اسلام کے احیاء کی لہر کی وجہ سے) جو زیادہ سے زیادہ پچاس سال پہلے کی بات ہے۔ اُس سے پہلے صرف شہروں کی اونچے طبقے کی خواتین برقعہ لیا کرتی تھیں۔ فلارنس میکارتھی کے مطابق بنگلہ دیش کی خواتین میں برقعے اور نقاب کی مقبولیت کی وجہ ان خواتین کے اندر اِس احساس کا پیدا ہونا ہے کہ برقعے کی وجہ سے گھر سے باہر ان کی آزادی میں اضافہ ہوا ہے۔'' (۲۱)

اسی طرح ماہرین علم عمرانیات ڈبلیو ایل سلوکم (W.L.Slocum)' جمیلہ اختر اور ابرار فاطمہ ساہی نے ایک تحقیق لاہور کے چھ دیہاتوں پر کی اور اسے پنجاب یونیورسٹی کے Social Sciences Research Center نے ۱۹۶۰ء میں طبع کیا۔ اس تحقیق میں انہوں نے مسلمان خواتین کی سماجی زندگی کا مطالعہ کیا' انہوں نے اپنی تحقیق کے خلاصہ میں لکھا:

*"Observation of Purdah is a symbol of prestige and fashion in Punjabi Villages."*

''پنجاب کے دیہاتوں میں خواتین میں پردے پر عمل دراصل عزت اور فیشن کی علامت سمجھا جاتا ہے۔''

چند سال پہلے امریکہ کے مقبول ترین اخبار نیویارک ٹائمز کے ۲۵ اکتوبر ۲۰۰۲ء کے شمارے میں سعودی عرب کی خواتین پر ایک تحقیق چھپی جس کا عنوان تھا: Saudis in Bikinis۔ اس تحقیق کا مصنف نکولس کرسٹاف (Nicholas Kristof) ہے جس کے دل میں اسلام کے لیے زہر بھرا ہوا ہے اور اُس نے مضمون میں جگہ جگہ اپنی خباثت کا اظہار بھی کیا ہے۔ لیکن مضمون نگار اس بات پر اپنا سر پیٹ کر رہ گیا ہے کہ جب اُس نے سعودی عرب کی باپردہ مسلمان خواتین کے انٹرویو کیے اور ان کے سامنے نقاب اور برقعے کی برائیاں کیں تو اس نے دیکھا کہ تقریباً سبھی سعودی خواتین پردہ کرنے پر خوش ہیں بلکہ پُراعتماد ہیں۔

لانا نامی ایک خاتون جو خوراک کی ڈاکٹر ہے' نے انٹرویو میں کہا: ''میں اپنا جسم اور اپنا

چہرہ ڈھانپتی ہوں اور میں خوش ہوں کہ میں ایک مذہبی لڑکی ہوں جو خدا کے احکامات پر عمل کرتی ہے۔ میں کھیلیں کھیل سکتی ہوں اور ہوٹلوں میں جاسکتی ہوں اور جو چاہوں پہن سکتی ہوں لیکن مردوں کے سامنے نہیں۔ میں اپنی ٹانگیں اور اپنا جسم مردوں کو کیوں دکھاؤں؟ کیا یہی اصل آزادی ہے؟''

شہر ریاض کی بہت سی سعودی خواتین نے مضمون نگار نکولاس کو انٹرویو کے دوران یہی بات بتائی کہ ''سعودی خواتین ہی اصل میں آزاد خواتین ہیں —— جنسی استحصال سے آزاد' عریاں فلم اور میڈیا سے آزاد' اپنے اجسام کو گاڑیوں اور کوکا کولا کے اشتہاروں میں استعمال ہوتا دیکھنے سے آزاد۔ یہ دراصل مغربی عورت ہے جسے مردوں نے اپنے ہاتھوں کا کھلونا بنالیا ہے۔''

مسلمان خواتین کو برقع کے اندر تخلیے اور پوشیدگی (Sense of Privacy) کا احساس ہوتا ہے۔ انہیں برقعے میں آزادی محسوس ہوتی ہے۔ شکاگو یونیورسٹی کی محقق خاتون حنا پاپانک جس نے پردے کے سسٹم کو سمجھنے کے لیے انڈیا' بنگلہ دیش اور پاکستان کے خطے میں کئی سال ریسرچ کی' اسلامی پردے کے متعلق لکھتی ہے:

> ''برقعہ خواتین کے لیے اس بات کو ممکن بناتا ہے کہ وہ تخلیے اور پوشیدگی میں رہتے ہوئے گھر سے باہر نکل سکے۔ برقعے کو ایک ایسی شے سمجھا جاسکتا ہے جو آزادی کی خاطر وجود میں آئی اور اکثر خواتین کی اس کے متعلق یہی رائے ہے (کہ یہ آزادی بخشتا ہے)۔ برقعہ اس بات کا ایک واضح سماجی سگنل ہوتا ہے کہ اس کو پہننے والی ایک خلوت نشین عورت ہے' البتہ برقعے کی مخصوص قسم انسان کے معاشی طبقے' دولت' معاشرتی رتبے اور علاقے کی نمائندگی کرتی ہے...... ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو سڑک پر چلنے والے شخص کو برقعے اور نقاب میں ملبوس خواتین کہ جن کی شخصیت پردے کے اندر مستور ہوتی ہے' بالکل ایسے لگتی ہیں جیسے سڑک پر چلنے والے راہگیر کو گاڑیوں میں سوار لوگ نظر آتے ہیں (یعنی وہ شخص انہیں نہیں دیکھ سکتا' لیکن گاڑیوں میں سوار انہیں دیکھ سکتے ہیں)۔''(۲۲)

آج ہم اسلام کی پردے سے متعلق تعلیمات کا دوسرے مذاہب سے مقابلہ کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی تعلیمات اعلیٰ (superiour) اور فطرت کے قریب ہیں' حتیٰ کہ بعض غیر مسلم مفکرین اور محققین بھی اسلامی پردے کی برتری کے قائل ہو گئے ہیں۔ اب ہم نے یہ دیکھنا ہے کہ کیا مغرب کی تقلید میں ہماری بقا ہے یا اسلام کی آغوش میں ہمارے لیے راہِ نجات ہے؟

﴿فَبِاَیِّ حَدِیْثٍۢ بَعْدَهٗ یُؤْمِنُوْنَ ۝۵۰﴾ (المرسلٰت)

''اب (اس قرآن کے بعد) اور کونسا کلام ایسا ہوسکتا ہے جس پر یہ ایمان لائیں؟''



## حواشی

(۱) منوسمرتی' ج ۳' ص ۵۶۔۶۰۔
(۲) منوسمرتی' ج ۵' ص ۱۴۵۔
(۳) منوسمرتی' ج ۵' ص ۱۵۴' ۱۵۷۔
(۴) سنن ابی داوٗد' کتاب الادب' باب فی فضل من عال یتیما۔
(۵) صحیح البخاری' کتاب الجهاد والسیر' باب من استعان بالضعفاء والصالحین فی الحرب۔
(۶) بحوالہ: Comparative Studies in Society and History' ج ۱۵' ص ۲۸۹۔۳۲۵۔
(۷) ایضاً۔
(۸) صحیح البخاری' کتاب النکاح' باب لا یخلون رجل بامرأة الاذو محرم ...... وصحیح مسلم' کتاب السلام' باب تحریم الخلوة بالاجنبیة والدخول علیها۔
(۹) شرح صحیح مسلم۔
(۱۰) بحوالہ RAIGBAI' جون ۱۹۷۸ء' ج ۱۳' ص ۲۳۳۔۲۱۸۔
(۱۱) رگ وید' منڈل ۱۰' اشوکت ۸۵' رچا ۴۴۔
(۱۲) شرح صحیح مسلم۔
(۱۳) سنن الترمذی' کتاب الرضاع' باب ما جاء فی کراهیة خروج النساء فی الزینة۔
(۱۴) صحیح البخاری' کتاب الجمعة' باب العلم الذی بالمصلی۔
(۱۵) فتح الباری' ج ۲' ص ٤٦٦۔
(۱۶) المبسوط' ج ١٦' ص ٨٠۔
(۱۷) المجموع' ج ٨' ص ١٤٠۔
(۱۸) سنن ابن ماجه' کتاب الزهد' باب الحیاء۔ وموطا امام مالك' کتاب الجامع' باب ما جاء فی الحیاء۔
(۱۹) بحوالہ: Comparative Studies in Society and History' ج ۱۵' ص ۲۸۹۔۳۲۵۔
(۲۰) بحوالہ Pakistan: Society and Culture' مطبوعہ امریکہ' ۱۹۵۷ء۔
(۲۱) Michigan State University, Department of Sociology' غیر مطبوعہ ایم اے کا مقالہ' ۱۹۶۷ء۔
(۲۲) بحوالہ: Comparative Studies in Society and History' ج ۱۵' ص ۲۸۹۔۳۲۵۔

❁❁❁

# نکاح کی ضرورت اور اہمیت

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

اسلام دین فطرت ہے اور اس کی تمام تعلیمات مفید اور متوازن ہیں۔ اس لیے کہ اس کے تمام احکام خود خالق کے بنائے ہوئے ہیں جو انسان کی ضروریات سے خود انسان سے بھی زیادہ واقف ہے۔ جب آدمؑ بنائے گئے تو ان کے سکون کے لیے ان کی بیوی حواؑ کو تخلیق کیا گیا۔ اس طرح اس جوڑے سے نسل انسانی کا آغاز ہوا۔ آج کرۂ ارضی پر بسنے والے اربوں لوگ اسی ایک جوڑے کی اولاد ہیں۔

اسلام میں تجرد کی زندگی کو پسند نہیں کیا گیا۔ اگرچہ بعض دوسرے مذاہب اسے باعث فضیلت قرار دیتے ہیں، مگر ان معاشروں میں جب رہبانیت اختیار کر کے نکاح سے فرار اختیار کیا گیا تو ایسے بھیانک نتائج برآمد ہوئے کہ انسان اخلاقی اعتبار سے حیوانوں سے بھی نیچے چلا گیا۔ ایسا ہونا ضروری بھی ہے، کیونکہ جب فطرت کے ساتھ ٹکر لی جائے گی تو اس کے نتائج تباہ کن ہی ہوں گے۔

فطری تقاضے پورے کرنے کے لیے نکاح ضروری بھی ہے اور پسندیدہ بھی۔ ایک مرد اور عورت نکاح کے بعد میاں بیوی کے رشتے میں منسلک ہو کر ایک خاندان کی بنیاد رکھتے ہیں۔ اس طرح ایک چھوٹا سا ادارہ وجود میں آجاتا ہے۔ اس ادارے کا نظام چلانے کے لیے مرد کو سربراہ (قوام) بنایا گیا ہے، کیونکہ ہر چھوٹے یا بڑے ادارے کے لیے ایک سربراہ کا ہونا ضروری ہے۔ سربراہی ایک اعزاز ہے مگر اس کے ساتھ ایک بھاری ذمہ داری بھی ہے۔ مسلمان خاتون گھر کے اندرونی کاموں کو انجام دے گی جبکہ مرد معیشت کی ذمہ داری نبھانے کے لیے گھر سے باہر کام کاج کے لیے جائے گا اور اپنے خاندان کی ضروریات پوری کرے گا۔ اگر میاں بیوی اپنے اپنے فرائض کو ذمہ داری سے اسلامی تعلیمات کے مطابق ادا کریں تو معاشرے کی اس بنیادی اکائی کے افراد نہ صرف خود زندگی کا حقیقی لطف اٹھائیں گے بلکہ



پورے معاشرے کے لیے مفید ثابت ہوں گے۔

تجرد کی زندگی بے سکونی اور ذہنی انتشار پیدا کر کے انسان کی شخصیت کو توڑ پھوڑ کا شکار کر دیتی ہے، جبکہ ازدواجی زندگی اگر اسلامی تعلیمات کے مطابق گزاری جائے تو اس میں فائدے ہی فائدے ہیں۔

مرد اور عورت کے درمیان فطری کشش ہے، لہٰذا ان کا ایک دوسرے سے کٹ کر رہنا فطرت کی مخالفت کرنا ہے اور اس کے نتائج اچھے نہیں نکل سکتے۔ جو مرد یا عورت نکاح کی پابندی کو قبول نہیں کرتے وہ سخت مشکل میں پھنس جاتے ہیں۔ ان کی زندگی میں تلخی اور انتشار پیدا ہو جاتا ہے اور وہ طرح طرح کی بداخلاقیوں اور نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں، جبکہ نکاح کی پابندیاں اختیار کر کے مرد اور عورت جنسی خرابیوں سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ جب انہیں جسمانی سکون ملتا ہے تو اُن کی روحانی اور اخلاقی حالت بھی خوب تر ہو جاتی ہے۔

نکاح نسل انسانی کی بقا کا ذریعہ ہے۔ موت انسانی زندگی کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ ہر شخص جو دنیا میں آتا ہے اسے موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ نسل انسانی کے باقی رہنے کے لیے ضروری ہے کہ جانے والے اپنی جگہ دوسرے انسان چھوڑ جائیں۔ یہ بھی ضروری ہے کہ ان نئے آنے والوں کو رہائش اور خوراک کے علاوہ پرورش، تعلیم و تربیت اور شفقت میسر آئے۔ پس ان بچوں کو باپ کی شفقت اور ماں کی مامتا مل جاتی ہے۔ ماں باپ اپنے بچوں کی پرورش اور نگہداشت کی ذمہ داریاں پوری کر کے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ بچوں کی ضروریات پوری کرتے ہوئے ماں باپ کو جو مشقت اٹھانی پڑتی ہے وہ انہیں حقیقی مسرت دیتی ہے۔ وہ پوری کوشش کرتے ہیں کہ ان کے بچے بڑے ہو کر اچھے انسان بنیں، خود بھی نام کمائیں اور ان کے لیے بھی عزت کا باعث بنیں۔ یہی وجہ ہے کہ جس جوڑے کے ہاں اولاد نہیں ہوتی وہ اولاد کی شدید خواہش رکھتے اور اولاد کی کمی شدت سے محسوس کرتے ہیں، بلکہ بعض اوقات کسی کا بچہ گود لے کر اس کی پرورش کرتے اور فطری ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

نکاح مرد اور عورت کی زندگی کی تکمیل کرتا ہے۔ نکاح کے بعد مرد اور عورت پر ذمہ داریوں کا بوجھ پڑتا ہے اور انہیں دوسروں کے ساتھ مل جل کر زندگی گزارنے کا سلیقہ آتا ہے۔ اس طرح ان کی خفیہ صلاحیتیں بیدار ہوتی ہیں اور وہ معاشرے کا مفید حصہ بنتے ہیں۔ بچوں کی پرورش کے بعد جب ان کی شادیاں کی جاتی ہیں تو رشتہ داریوں میں اضافہ ہوتا ہے اور تعلقات بڑھتے ہیں۔

نکاح کے بعد میاں بیوی اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں مصروف ہو جاتے ہیں‘ ان کے پاس گزارنے کے لیے فضول وقت نہیں ہوتا۔ فارغ اور تنہا آدمی کے دماغ میں منفی سوچیں جنم لیتی ہیں۔ مشہور ہے کہ بے کار انسان کا دماغ شیطان کا مسکن ہوتا ہے‘ اُس کی زندگی بے مقصد ہو جاتی ہے‘ وہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو بے سہارا اور اکیلا تصور کرتا ہے اور یہ تنہائی عذاب سے کم نہیں ہوتی۔

چونکہ اخروی نجات دین اسلام میں منحصر ہے اس لیے ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ اسلام کی اشاعت میں کردار ادا کرے تاکہ غیر مسلم اسلام قبول کر کے نجات کے امیدوار بن سکیں اور کرۂ ارض پر مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہو۔ مسلم آبادی میں اضافے کا بڑا ذریعہ نکاح ہے۔ نکاح کے ساتھ وجود میں آنے والے جوڑے کے ہاں مسلمان بچے پیدا ہوں گے جو مسلم آبادی میں اضافہ کریں گے۔ اگر ماں باپ ان کی تربیت صحیح انداز میں کریں گے تو وہ بڑے ہو کر اچھے مسلمان بنیں گے اور معاشرے کے لیے مفید ثابت ہوں گے۔

یہاں ایک سوال رہ جاتا ہے کہ عائلی زندگی میں طرح طرح کے مسائل بھی پیش آتے ہیں۔ اختلافات اور جھگڑے پیدا ہوتے ہیں۔ بدمزگیاں اور تلخیاں جنم لیتی ہیں۔ بعض اوقات یہ خرابیاں بڑے بھیانک نتائج کا سبب بنتی ہیں۔ مگر یاد رکھنا چاہیے کہ یہ ساری خرابیاں اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب میاں بیوی دونوں یا دونوں میں سے ایک اپنے فرائض کو ادا کرنے میں کوتاہی کرے۔ اگر مرد اپنے دائرہ کار میں کام کرے اور عورت اپنی ذمہ داریوں سے آگاہ ہو جو اسلام نے اس پر ڈالی ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ خانگی زندگی میں تلخی پیدا ہو۔ عورت کو چاہیے کہ خلوص نیت کے ساتھ مرد کی قوامیت (سربراہی) تسلیم کرے‘ اس کی اچھی مشیر بنے‘ اپنے مطالبات شوہر کی آمدنی تک محدود رکھے‘ پردے کی پابندی کرے‘ دینی کتب کا مطالعہ کرتی رہے تاکہ اسے اپنے حقوق اور فرائض سے آگاہی رہے۔ اسی طرح مرد اپنی سربراہی کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے عورت پر ظلم و زیادتی نہ کرے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ ’’عورتوں کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہو‘‘۔ جس کے پاس اختیار ہوتا ہے اس کے لیے اعتدال پر رہنا مشکل ہوتا ہے‘ پس مرد اپنے وسائل کے اندر رہتے ہوئے عورت کی جائز ضروریات پوری کرنے میں کوتاہی نہ کرے۔ الغرض اگر میاں بیوی اسلامی تعلیمات کے مطابق اپنے اپنے فرائض انجام دیں اور حدود سے تجاوز نہ کریں تو خانگی زندگی جنت نظیر ہو سکتی ہے۔ oo



## بقیہ : عرضِ احوال

بنگلہ دیش میں بھی بات اسلام کے حوالے سے نام سے آگے بڑھے گی۔ یوں سمجھ لیں کہ ۱۹۷۱ء سے پہلے ایک پاکستان دو حصوں میں تقسیم ہو کر بھارت کو اپنے بیچ میں لیے ہوئے تھا۔ اب بھارت مشرقی اور مغربی اَطراف سے دو پاکستانوں کے درمیان سینڈوچ ہو سکتا ہے۔ لیکن اس حقیقت کو دشمنوں سے زیادہ خود پاکستانی حکمران اور موجودہ نظام سے مفاد حاصل کرنے والے تسلیم کرنے سے انکاری ہیں۔ اُن کے اَذہان و قلوب میں امریکہ کی دہشت اور بڑائی کا تصور اتنا زیادہ ہے کہ انہیں امریکہ کا زوال نظر نہیں آ رہا۔ قصہ کوتاہ‘ ہم کہنا یہ چاہتے ہیں کہ بنگلہ دیش کے نظری طور پر قبولِ اسلام کو جو لوگ کوئی وزن نہیں دے رہے اور اس کی اہمیت کو سمجھ نہیں پا رہے وہ احمقوں کی جنت میں رہتے ہیں۔

اُدھر ترکی میں بھی سیکولرازم پسپائی اختیار کر رہا ہے۔ سیکولر نظام کے حامی فوج کے تینوں سربراہوں نے جس طرح اسلام پسند حکومت کے آگے ہتھیار پھینکے ہیں یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں۔ اگرچہ ترکی کا اسلام بہت لبرل ہے‘ لیکن یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ترکی کہاں سے سفر کر کے کہاں تک پہنچا ہے۔ جس ملک میں اذان دینا‘ عربی لکھنا پڑھنا‘ داڑھی رکھنا‘ حجاب پہننا جرم ہو اُس ملک کے وزیراعظم کی اہلیہ اگر حجاب پہننے لگے تو یہ معمولی بات نہیں ہے۔ ترکی کے اس سمت سفر کو بھی اب کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔ بہرحال اسلامی نظام قائم کرنے کے خواہش مندوں کو ابھی بہت سفر طے کرنا ہے‘ ابھی بہت رکاوٹیں دور کرنی ہیں۔ ابھی بڑی مشکلات پڑنے کو ہیں‘ ابھی ایک طویل اور شاید خونریز جنگ بھی لڑنا پڑے گی‘ ابھی مال و جان کا نذرانہ اس راہ میں پیش کرنا ہوگا۔ منزل آسان نہیں مشکل ہے‘ مگر ناممکن نہیں۔ ہمتِ مرداں مددِ خدا!

ہم آخر میں بنگلہ دیش کے عوام اور حکومت کو دل کی گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتے ہوئے یہ عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ اس خطہ میں اسلام کو اگر غلبہ حاصل ہوتا ہے تو یہ سہرا افغان طالبان کے سر ہوگا‘ جنہوں نے شیطانِ اکبر امریکہ کی طلسماتی قوت کو سرنگوں کر کے غلبۂ اسلام کی بنیاد رکھ دی ہے۔ oo

**اطلاع برائے قارئین**

قارئین کرام نوٹ فرما لیں کہ میثاق کے زیرِ نظر شمارہ کی حیثیت اگست اور ستمبر 2011ء کی مشترکہ اشاعت کی ہے۔ چنانچہ اس کی ضخامت میں بھی خاطر خواہ اضافہ کر دیا گیا ہے۔

# نحو وصرف کی صحیح اور جامع تدریس کے اصول

محمد بشیر ☆

صرف ونحو کا فن عربی زبان کا ایک اہم جزو اور بنیادی حصّہ ہے اور اس کی تفہیم وتعلیم میں بہت مفید اور معاون ہے۔ اس کی اسی افادیت کی وجہ سے اس کی تدریس علومِ شرعیہ اور علومِ عربیہ کی تدریس کے ساتھ ہی شروع کر دی جاتی ہے' تاکہ زیرِ تعلیم کمسن بچے شروع ہی سے اس کے مسائل سے واقف ہو کر اسلامی وعربی علوم کی اچھی اور پختہ تعلیم حاصل کر سکیں۔ لیکن ہمارے علاقے اور ملک کے اکثر اداروں میں اس فن کی تعلیم وتدریس میں عرصے سے ایسی کئی سنگین غلطیاں ہو رہی ہیں جن کی وجہ سے اس مفید فن کی تدریس مفید کم اور مضر زیادہ بن گئی ہے' اور اب صورت حال یہ ہے کہ ہمارے اسلامی مدارس کے طلبہ' معلّمین اور عامۃ المسلمین میں عربی صرف ونحو کا یہ مضمون سب سے زیادہ مشکل' خشک اور خوفناک شمار ہوتا ہے' اور اسی وجہ سے بچوں کی ایک بہت بڑی تعداد اسلامی مدارس میں داخل ہونے سے انکار کر دیتی ہے' جبکہ زیرِ تعلیم بچوں کی بہت بڑی تعداد مدارس کے نصاب اور طریقہ تدریس سے مایوس ہو کر فرار ہو جاتی ہے۔

مصر کی جدید علمی وادبی اور دینی ترقی کے عظیم راہنما امام محمد عبدہ کی دور طالب علمی کے ابتدائی واقعات میں مذکور ہے:

> (ترجمہ) ''انہوں نے اپنے گاؤں کے مکتب میں قرآن حفظ کر لیا تو مزید تعلیم کے لیے انہیں جامع مسجد احمدی میں اور پھر جامعہ ازہر میں داخل کرایا گیا' لیکن انہیں شروع میں ایسے معلمین سے واسطہ پڑا جو قابل نہ تھے اور تفہیم کے بغیر مسائل رٹاتے تھے تو وہ اُکتا کر ان دونوں درس گاہوں سے بھاگ گئے۔ پھر جب علم کا مزہ آیا تو ہر تلخی وسختی کو برداشت کیا اور اسباق میں خوب محنت کی اور تھوڑے وقت میں وافر علم حاصل کر لیا۔'' (۱)

ہر سال رونما ہونے والے ایسے واقعات سے ہمارے مخلص اور متدین لوگوں کے ذہنوں میں اسلامی مدارس کے نصاب اور طریقہ تعلیم کے بارے میں طرح طرح کے سوالات اور

☆ متخصص فی تعلیم اللغة العربية لغير العرب' (برائے رابطہ: 051-2253733)



شکوک پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ بات صرف اس حد تک محدود نہیں ہے' بلکہ ہمارے معاشرے اور خطے کے تمام تعلیم یافتہ طبقوں' جن میں علماء' معلمین' ناظمین بھی شامل ہیں' کے ذہنوں میں عربی زبان کے بارے میں طرح طرح کے غلط خیالات اور تصورات (مثلاً عربی غیر ملکی زبان ہے اور عربی نہایت مشکل وپیچیدہ زبان ہے وغیرہ وغیرہ) پختہ اور راسخ ہو چکے ہیں اور صدیوں سے نسل در نسل منتقل ہوتے چلے آ رہے ہیں۔ اس لیے ہمارے ہاں ان مضامین کے مروجہ نصابِ تعلیم' نصابی کتابوں اور طریقہ تعلیم کا مفصل جائزہ لینا ضروری ہو جاتا ہے۔ میں دردمند علماء' معلمین اور مدارس کے ناظمین سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ میری ان گزارشات اور آراء کو اس نقطہ نظر سے پڑھیں کہ میں انہیں اسلامی مدارس کے طلبہ وطالبات اور معلمین کی بھلائی اور ترقی کے لیے پیش کر رہا ہوں۔

## تعلیم وتربیت کی عظیم قدرتی درس گاہ کا طریقہ تعلیم عملی ہے

اس صورتحال کا جائزہ لینے کے لیے سب سے پہلے ہم خالق کائنات سبحانہ وتعالیٰ کی اس عظیم اور وسیع درس گاہ پر ایک نظر ڈالتے ہیں جو ساری کائنات میں پھیلی ہوئی ہے اور جس میں تمام انسانوں بلکہ دیگر مخلوقات کو ان سب کی اپنی اپنی زبانیں سکھانے کا قدرتی نظام ہر وقت جاری وساری رہتا ہے۔ آئیں دیکھئے' یہاں ہر زبان اور اس کی گرامر کی تعلیم دینے کا اسلوب سو فیصد عملی ہے۔ اس میں ہر بچہ اپنی ولادت کے دن سے ہی اپنی مادری زبان کو اپنے ماحول یعنی اپنے والدین اور دوسرے عزیز واقارب کے ساتھ میل جول کے ذریعہ سیکھتا ہے۔ وہ ان کی گفتگو کو سنتا اور سیکھتا رہتا ہے اور وہ بھی اسے زبان کے الفاظ' جملے اور محاورے سکھاتے رہتے ہیں۔ وہ رفتہ رفتہ ان محاوروں اور استعمالات اور قواعد کے عمل اور صحیح استعمال کا عادی ہو جاتا ہے۔ یہ بچوں کو زبان' عقیدہ اور اخلاق وعادات اور معمولات زندگی سکھانے کی قدرتی درس گاہ ہوتی ہے اور اس میں تعلیم وتربیت کا طریقہ فطری اور عملی ہوتا ہے۔ اس عظیم اور دائمی قدرتی نظام تعلیم سے ہم بہت کچھ سیکھ کر اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ فهل من مدّكر ؟!

## صرف ونحو کی صحیح تعلیم کے اصول

میرے سامنے اس وقت برصغیر پاک وہند کے علاوہ کئی عرب ملکوں جن میں مصر' سعودی عرب' عراق' اردن' یمن' اور متحدہ عرب امارات' قطر وغیرہ شامل ہیں' کے نصاب ہائے تعلیم

موجود ہیں۔ان تمام ممالک کے ماہرین تعلیم نے عربی زبان اور نحو وصرف کی صحیح اور مؤثر تعلیم کے لیے جن اہم اصولوں کو واضح کیا ہے' میں یہاں ان کا خلاصہ پیش کرتا ہوں:

## (۱) نحو وصرف کے قواعد کی تعلیم مقصود بالذّات نہیں ہوتی

صرف ونحو کی معلومات' گردانیں اور قواعد کوئی ایسا مستقل اور الگ فن نہیں ہیں کہ انہیں عربی زبان سے علیحدہ کر کے پڑھایا جائے' کیونکہ صرف ان کی تعلیم مقصود بالذات نہیں ہوتی' بلکہ ان کی تعلیم وتدریس کی اساس یہ ہوتی ہے کہ یہ قرآن کریم' حدیث شریف اور دیگر علومِ شرعیہ کے صحیح فہم وتفسیر میں مفید ہیں اور بچوں کو عربی زبان کی عبارت کو صحیح پڑھنے' صحیح لکھنے اور صحیح بولنے میں معاون ہیں۔اس لیے اس کی تدریس کے دوران اس کے اصل مقصد یعنی عربی زبان میں صلاحیت ومہارت پیدا کرنے پر توجہ دی جائے۔اس اصول پر تمام عرب ملکوں کے ماہرینِ تعلیم متفق ہیں اور ان سب ملکوں میں اسی کے مطابق صرف ونحو کی تعلیم دی جاتی ہے کہ گرامر کے قواعد کو عملی مشق اور تربیت کے مسلسل عمل سے ذہن نشین کرایا جاتا ہے۔اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے بطور مثال میں یہاں سعودی عرب کی وزارت تعلیم کی **الوکالة العامة للتطوير التربوی** (ڈائریکٹریٹ جنرل برائے تعلیمی ترقی) کی شائع کردہ تعلیمی کتاب (کتاب النحو و الصرف برائے سال ۱۴۱۵ھ موافق ۱۹۹۴ء کے مقدمہ سے تین اقتباسات پیش کرتا ہوں:

(۱) راعينا فی كتاب النحو والصرف للصف الثانی الثانوي' وضوح الفكرة' وسهولة العبارة' ودقة العرض' وإيجاز القاعدة' وكثرة التمرينات۔ وقد استقينا معظم أمثلته من القرآن الكريم كتاب الإسلام الخالد' حتى يمرن لسان الطلبة والطالبات على تلاوة آياته الكريمة' ليتبين لهم الغرض من دراسة قواعد العربية' وهو الاستعانة بها على فهم آيات القرآن الكريم' وترتيلها ترتيلا' لا لحن فيه ولا تحريف۔ كما جاء ت بعض أمثلته من عيون الشعر العربي فی عصوره المختلفة' وكذلك كان لأمثال العرب وحكمها' وبديع قصصها نصيب فی تمرينات الكتاب' حتى يمتزج درس القواعد بدرس الأدب' ويربط الطلبة بين درس القواعد' وفنون العربية الأخرى' وبذلك يرأ درس النحو من الجمود الذی ران عليه فترة طويلة بتلك الأمثلة المصنوعة' التي يبتعد الكثير منها عن روح اللغة' وما فيها من عبقرية وجمال۔ (۲)

''ہم نے ثانوی سکول کی سال دوم کی اس کتاب النّحو والصّرف میں فکر ونظر کی صفائی' عبارت کی آسانی' طرز بیان کی گہرائی' قاعدے کے اختصار اور تمرینات کی کثرت



کا اہتمام کیا ہے اور زیادہ تر مثالوں کو اسلام کی ابدی کتاب قرآن کریم سے لیا ہے' تاکہ ہمارے بچوں کی زبانیں آیات کریمہ کی تلاوت سے تَر رہیں اور قواعد کی تعلیم کے اصل مقصد کو سمجھ لیں اور وہ یہ کہ قرآن مجید کی آیاتِ بیّنات سمجھنے اور ان کو بغیر لحن و تحریف کے پڑھنے میں ان سے مدد لینا ہے۔

پھر کچھ مثالیں ہم نے مختلف ادوار کے عمدہ اشعار سے لی ہیں۔نیز عربی امثال وحکم اور کچھ عمدہ کہانیوں کو بھی شامل کیا ہے' تاکہ نحو کے اسباق کو ادب کے ساتھ مربوط کر دیا جائے اور طلبہ قواعد کے اسباق کے ساتھ ساتھ عربی کے دیگر فنون کے ساتھ بھی جڑے رہیں۔اس طرح نحو وصرف کی تدریس اس جمود سے پاک ہو جائے جو عربی زبان کی روح اور حسن وجمال سے عاری مصنوعی مثالوں کی صورت میں عرصہ دراز تک اس پر چھایا رہا۔''

(۲) ونود أن نلفت نظر الأساتذة الكرام' إلى أن دراسة القواعد وسيلة لا غاية تقصد لذاتها' بل تعين الطلبة على التعبير الصحيح' وضبط الأساليب' وتفهم لغة القرآن الكريم' والوقوف على أسرار بلاغته' فليس القصد أن يحفظ الطلبة القواعد النحوية عن ظهر قلب' ولا أن يرددوها بلا وعي' بل إن العبرة فی الدرس النحوي بكثرة القراء ة فی النصوص الأدبية' ومناقشة القواعد التی تخضع لها في ضبطها بالشكل' ولذلك أكثرنا من إيراد التمرينات عقب الأبواب المختلفة' لكي تثبت القاعدة' وترسخ فی ذهن الطلبة' وبذلك تتكوّن لديهم السليقة اللغوية' ويصبحون قادرين على النطق الصحيح بلا لحن أو خطأ (۳)

''ہم محترم اساتذہ سے گزارش کرتے ہیں کہ صرف ونحو کے قواعد کی تعلیم بذاتِ خود مقصود نہیں ہوتی' بلکہ یہ طلبہ کو صحیح بول چال' عبارتوں کو درست پڑھنے اور لغت قرآن کریم کے صحیح فہم اور اس کی بلاغت کے اسرار واسباب سے آگاہی کا مفید اور معاون ذریعہ ہے۔لہٰذا یہ مقصود نہیں کہ بچے انہیں زبانی یاد کریں اور انہیں بلا سمجھ رٹتے رہیں' بلکہ صرف ونحو کے قواعد کی صحیح تعلیم وتدریس کا معیار یہ ہے کہ چیدہ چیدہ ادب پاروں کو زیادہ پڑھایا جائے اور ایسے قواعد پر زیادہ بحث کی جائے جو ان کی صحیح تشکیل کی بنیاد بنتے ہیں۔اس وجہ سے ہم نے مختلف ابواب کے بعد زیادہ مشقیں لکھی ہیں تاکہ ہر قاعدہ کا استخراج ہو اور وہ عملاً بچوں کے ذہنوں میں راسخ ہو کر انہیں عربی محاوروں اور عبارتوں کا اچھا ذوق اور سلیقہ فراہم کرے اور وہ غلطی سے پاک نطق وتعبیر کے عادی ہوں۔''

یہ نصاب کمیٹی ایک دفعہ پھر معلّمات کو خصوصیت سے یہ ہدایت جاری کرتی ہے:

(۳) ملحوظة: إلى الأخوات المعلمات —— إن تدريس القواعد (النحو والصرف) بعيدًا عن إدراك مدلولاتها وصلتها بصحة المعنى‘والفهم‘ وتذوق العبارة يُفْقِدُها روحها الحقيقية‘ ويحيلها إلى قوالب جامدة‘ ولذا فإن المعلمة بجدها وإخلاصها‘ وحبها للغة القرآن الكريم تستطيع أن تربط بين القواعد والمعنى‘ وبين القواعد وصحة الفهم وتذوق النص‘ولاسيما من خلال التدريبات۔ وبقليل من الجهد المخلص مع الطالبات تتحول هذه الدروس إلى ثمرات شهية‘وتتفتح في أذهان الطالبات زهور المعاني‘وعبق الجمال الذي تميزت به هذه اللغة إن شاء الله۔(٤)

’’نوٹ برائے معلمات —— نحو وصرف کے قواعد کو زبان دانی سے علیحدہ کر کے پڑھائے جائے تو وہ اپنی حقیقی روح سے محروم ہو کر صرف بے مقصد اور جامد سانچے بن جاتے ہیں۔ اس لیے ہم معلمات سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ ان کے صحیح مقاصد کو مدّنظر رکھیں اور عبارت کے صحیح فہم اور عمدہ ذوق کی تربیت میں ان کے فوائد کی تطبیق کرائیں اور لغتِ قرآن سے محبت اور محنت و اخلاص سے گرامر کے ذریعہ عربی زبان کے عمدہ سلیقہ اور ذوق کی آبیاری پر توجہ دیں‘ خصوصاً تمرینات کے ذریعے‘ کیونکہ تھوڑی سی محنت سے یہ اسباق طالبات کے ذہنوں میں عمدہ پھلوں اور پھولوں کی بہار بن کر ثمرات اور خوشبو کی بارش برسا سکتے ہیں‘ خصوصاً اس حسن و جمال کی فضا۔ میں جو لغت قرآن کا امتیاز ہے‘ان شاء اللہ تعالیٰ!‘‘

## صَرف ونحو کو عربی زبان سے علیحدہ کر کے پڑھانا غیر فطری امر ہے

اس اصول کو مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی واضح کیا ہے‘ وہ لکھتے ہیں:

’’دوسری حقیقت یہ ہے کہ زبان کے قواعد کو زبان سے علیحدہ کر کے مجرد علمی طریقہ پر پڑھانا غیر فطری امر ہے۔ قواعد بغیر مشقوں اور جملوں اور عبارتوں کے نہ ذہن نشین ہو سکتے ہیں نہ جاگزیں۔ دنیا کی تمام زبانوں کے قواعد (صرف ونحو) مشق اور مثالوں سے پڑھائے جاتے ہیں اور ان کو عملی طور پر ذہن نشیں کیا جاتا ہے۔ ہمارے یہاں عرصہ دراز سے صرف ونحو کو زبان سے الگ کر کے پڑھایا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ شرح جامی اور شروح الفیہ تک پہنچ جانے والے اور ادھر شافیہ اور اس کے شروح تک عبور کرنیوالے جو طلبہ نحو وصرف کے دقائق اور باریکیاں جانتے ہیں نہ صحیح لکھ سکتے ہیں



نہ بول سکتے‘ اور بعض اوقات عبارت تک غلط پڑھتے ہیں۔ یہ سب اس کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے پیرا کی کا فن پانی سے باہر سیکھا ہے۔ جب ان کو دریا میں گھسنے کا موقع ملتا ہے تو اصولِ شناوری جو انہوں نے نظری طور سے سیکھے تھے کچھ کام نہیں آتے۔‘‘(۵)

تعلیم وتربیت کے اسی اہم اصول کو مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ ایک دوسرے مقام پر واضح کرتے ہیں اور اسے نظر انداز کرنے کے مضر اثرات ونتائج کی تشریح یوں کرتے ہیں:

’’دوسری حیثیت یہ ہے‘ جو اگرچہ ثانوی ہے مگر نظر انداز کرنے کے قابل نہیں‘ کہ یہ عربی زبان عہدِ رسالت اور ابتدائے اسلام میں بھی ایک زندہ زبان تھی۔ اسلامی تاریخ کے ہر دور میں ایک زندہ زبان رہی ہے اور اس زمانے میں بھی یہ ایک زندہ اور ترقی یافتہ زبان ہے‘ جو تمام لسانی ضرورتوں کو پورا کرنے اور اظہار خیال کا ذریعہ بننے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے اور جو قرآن کی بدولت اپنی اصلی شکلوں میں محفوظ ہے۔ اس حیثیت کا فطری تقاضا ہے کہ ہمارا اس سے تعلق بھی ایک زندہ اور عملی تعلق ہو‘ ہم اس کو ایک وسیع انسانی زبان کی طرح جانتے ہوں‘ اس میں بے تکلف اظہارِ خیال کر سکتے ہوں‘ اس کو تقریر وتحریر میں استعمال کر سکتے ہوں۔ وہ ہماری تصنیفات‘ خط وکتابت اور مجالس کی زبان بن سکتی ہو۔ یہ ایک بڑی تعجب خیز اور ناقابل فہم بات ہے کہ کوئی فرد یا جماعت اپنی زندگی کا ایک معتد بہ حصہ اور اپنی ذہنی صلاحیتیں ان علوم وتصنیفات کے درس ومطالعہ میں صرف کرے جو عربی زبان میں لکھی گئی ہیں‘ لیکن اس زبان میں اظہارِ خیال سے بالکل معذور وقاصر ہو۔ زبانوں کے سلسلے کا یہ بالکل انوکھا تجربہ ہے جو صرف ہندوستان کے عربی مدارس اور علمی مجالس کی خصوصیت ہے۔

اس معذوری کی بڑی وجہ یہ ہے کہ عربی زبان کو‘ جس کی بدولت ہم اسلام سے علمی تعلق پیدا کرتے ہیں‘ کبھی زبان کی حیثیت سے پڑھنے پڑھانے کی کوشش نہیں کی گئی۔ اس کو بھی ایک نظری علم اور ایک کتابی فن کی حیثیت سے دیکھا گیا اور صرف کتابوں کے سمجھنے کا ذریعہ سمجھا گیا۔ اس ذہنیت اور نقطہ نظر کا نتیجہ یہ ہے کہ کبھی اس کی عملی مشق اور تحریر وانشاء کی طرف توجہ نہیں دی گئی۔ اور اس کا انجام یہ ہے کہ ہمارے بہت سے فضلاء مدارس اپنی دوسری صلاحیتوں کے ساتھ عربی زبان میں چند سطریں لکھ لینے یا چند منٹ گفتگو کر لینے پر قادر نہیں‘ خصوصاً جبکہ یہ تحریر یا گفتگو عام زندگی یا روزمرہ کی ضرورت سے متعلق ہو اور خالص دینی یا علمی بحث میں محدود نہ ہو۔ یہ کمی اہل نظر کو پہلے بھی محسوس ہوتی تھی‘ لیکن اب جبکہ عربی ممالک کے فضلاء سے اختلاط اور اجتماع کے زیادہ مواقع

پیدا ہو گئے ہیں اور دینی خدمت کا میدان زیادہ وسیع ہو گیا ہے یہ کمی زیادہ شدت سے محسوس کی جانے لگی ہے''۔ (۶)

## (۲) صرف ونحو کی تدریس کے دوران عملی تربیت کا جامع اہتمام کیا جائے

بچوں کو ان کے مختلف تعلیمی مراحل کے دوران صرف ونحو کی معلومات' گردانوں اور قواعد کے عملی استعمالات کی ایسی مؤثر مشق اور تربیت کا اہتمام کیا جائے کہ یہ قواعد' عربی عبارتوں کے فہم کے ساتھ ان کی صحیح قراءت' صحیح تحریر اور صحیح بول چال سکھانے کا ذریعہ بنیں' اور بچے ان کی تعلیم وتدریس کے دوران عربی کلمات اور محاوروں کا معقول ذخیرہ سیکھیں۔ اس طرح ان کی زبان وقلم پر صحیح عربی جملے' محاورے اور عبارتیں رواں دواں ہوں اور وہ آسانی اور روانی سے عربی زبان لکھ بول سکیں اور یہ نظر آئے کہ بچے عربی زبان کی اچھی اور معیاری تعلیم وتربیت حاصل کر رہے ہیں۔ نصاب تعلیم کے ان مقاصد کو مزید واضح کرتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ صرف ونحو کی تعلیمی کتاب میں عربی زبان کی مثالوں اور مشقوں کی تحریر اور ترتیب میں چار امور کو مدنظر رکھا جائے:

(۱) ان مثالوں اور مشقوں کی زبان مستند اور معیاری ہو: جس کی بہترین صورت یہ ہے کہ (۱) ان میں افصح الکتب قرآن کریم کی آیاتِ کریمہ (۲) احادیثِ نبویہ (۳) مشہور عرب شعراء کے آسان اور عمدہ اشعار اور حکماء وعلماء کے اقوال' حکم' قصص سے اقتباسات وغیرہ کو شامل کیا جائے۔

(۲) تربیتی مثالیں اور مشقیں بچے کے اپنے ماحول سے ماخوذ اور متعلق ہوں: لہٰذا یہ ضروری ہے کہ ان تربیتی مشقوں میں زیر تعلیم بچوں کے اپنے دینی اور معاشرتی ماحول (عقیدہ' گھر' درس گاہ' معاشرے' رشتہ داروں وغیرہ) سے متعلق صحیح اور معیاری جملوں' محاوروں' مثالوں' اور عبارتوں کو شامل کیا جائے' تاکہ بچے اس مستند اور معیاری عربی ذخیرۂ لغت سے واقف ہو کر اسے اپنے ماحول میں پڑھنے' لکھنے اور بولنے کی مشق کرتے ہوئے عربی کو ایک زندہ اور مستعمل زبان کی طرح سیکھیں۔

(۳) معیاری مثالوں اور مشقوں کی تعداد زیادہ ہو اور قواعد کم ہوں: پھر اسباق اور مشقوں میں تنوع ضروری ہے کہ کہیں (۱) اردو سے عربی ترجمہ (۲) عربی سے اردو ترجمہ (۳) خالی جگہ پُر کرنا (۴) کہیں تصحیحِ اغلاط (۵) کہیں متفرق اجزاء یا کلمات کو ملاتے ہوئے



مرکبات اور جملے بنانا (۶) مرکبات او رجملوں پر اعراب (۷) متضاد کلمات کی تحریر (۸) قرآن کریم اور حدیث شریف کی عبارتوں اور محاوروں کا تعارف (۹) نحو وصرف کے قواعد کی تطبیقات (۱۰) متنوع معروضی سوالات (۱۱) سیرتِ رسول ﷺ سے واقعات (۱۲) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم' اُمت کے قائدین اور علماء کی نصیحت آموز کہانیاں (۱۳) چیدہ اور عمدہ عربی اشعار (۱۴) سبق آموز واقعات (۱۵) تعلیمی لطائف وغیرہ۔

(۴) نصابی کتابوں میں مصنوعی اور فرضی مثالوں کو درج نہ کیا جائے: مثلاً جاء زید' ورأیت زیدا' مررت بزید..... وغیرہ کہ ایسے سب بے مقصد جملے ہیں اور ان سے فوائد حاصل نہیں ہوتے' بلکہ تعلیم وتربیت کے میدان میں بچوں کے ذہنوں پر منفی اثرات ڈالتے ہیں اور انہیں عربی زبان کے صحیح استعمالات اور محاوروں سے محروم رکھتے ہیں۔

## (۳) کمسن بچوں کو پورے فن کی تدریس نہ کی جائے بلکہ تدریج کا خیال رکھا جائے

بچوں کو صرف ونحو کی تعلیم وتدریس میں تدریج اور آسانی کو ملحوظ رکھا جائے اور پہلے ہی سال یا سالوں میں پورے فن یا فن کے زیادہ مسائل ومباحث کو پڑھانے کی کوشش نہ کی جائے' بلکہ پہلے اور دوسرے تعلیمی سال میں اس فن کے صرف کچھ یعنی تھوڑی سی بنیادی' آسان اور ضروری معلومات کی تعلیم پر اکتفا کیا جائے اور ان کی تعلیم کی زبان اور طرز بیان اتنے سادہ اور آسان ہوں کہ کم سن بچے انہیں آسانی سے پڑھیں اور سمجھ لیں۔ اسی طرح تدریس کے دوران فن کی عملی مشق اور تربیت کا مواد' مثالیں اور جملے بھی سادہ اور عام فہم ہونے چاہیے اور یہ بھی ضروری ہے کہ عملی مشق کے مواد اور جملوں کا زیر تعلیم بچوں کے اپنے ماحول' گھر' درس گاہ' عقیدے اور مشاغل سے گہرا تعلق ہو۔

پھر دوسرے اور تیسرے سال باقی مسائل اور مباحث کی ایسی مفصل تدریس کرائی جائے جس کے دوران مستند اور معیاری مثالوں اور مشقوں کے ذریعے عربی زبان و ادب کے استعمالات کی مؤثر تعلیم وتربیت کا اسلوب جاری رکھا جائے۔

عرب ممالک کے نصاب تعلیم میں پرائمری سکول کے آخری دو سالوں یعنی جماعت پنجم اور جماعت ششم اور مڈل سکولز کے تینوں سالوں تک اس مضمون کی تعلیم وتدریس اس طرح ہوتی ہے کہ عربی زبان کے صرف ابتدائی قواعد اور عام معلومات پڑھائی جاتی ہیں' جن میں خط اور املا بھی شامل ہوتا ہے' اور اس مضمون کی کتاب کا نام عموماً ''قواعد اللغة العربية'' یا

''مبادی قواعد اللغة العربیة'' (Basic Arabic Grammar) ہوتا ہے (یعنی کمسن بچوں کو اس فن کے نام کا تعارف کرانا ضروری نہیں سمجھا جاتا)۔ الغرض مڈل کی سطح تک اس کے صرف چند اور محدود بنیادی مسائل کی تعلیم دی جاتی ہے۔ بعدازاں ثانوی تعلیم کے مرحلے پر اس کی درسی کتاب کا نام ''مادة النحو والصرف'' یا ''کتاب النحو و الصرف'' ہوتا ہے اور فن کی مفصّل تدریس ہوتی ہے' اور وہ بھی اس نہج پر جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔

## (۴) ہر خودمختار ملک کا اپنا مستقل نظامِ تعلیم اور نصاب ہونا چاہیے

نحو وصرف کے معیاری ومفید نصاب اور طریقہ تدریس کا ایک اہم اور بنیادی تقاضا یہ بھی ہے کہ وہ عربی کو ایک زندہ' عملی اور ترقی یافتہ زبان کی طرح پڑھانے کا اہتمام کرے اور تربیت دے۔ اس تقاضے کی تکمیل کے لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ ہر خودمختار ملک ومعاشرے کا اپنا الگ اور مستقل نظامِ تعلیم ہو جس میں قرآن کریم اور حدیث شریف سے استفادے کے علاوہ امت کے اسلاف کے علمی وتہذیبی ورثے سے استفادے کے ساتھ ساتھ ملک کے بنیادی نظریے اور تقاضوں کی ترجمانی ہو اور زیرِ تعلیم بچے اپنے ملک اور ماحول کی تاریخ' حالات اور واقعات پر مہارت کے ساتھ لکھ بول سکتے ہوں اور بوقتِ ضرورت اس کے استحکام اور دفاع اور اپنے شہریوں کی خدمت کا فریضہ انجام دے سکتے ہوں۔ اس سے ثابت ہوا کہ کسی خودمختار ملک اور معاشرے اور اس کے نظامِ تعلیم کے درمیان زمان ومکان کے زیادہ فاصلے اور مسافت حائل نہیں ہونی چاہیے' خصوصاً آج کے سرعت اور تیزی سے ترقی کرنے والے ممالک اور معاشروں میں قدیم یا غیر ملکی نصاب پر اصرار کا کوئی جواز نہیں رہتا۔

## (۵) درسی کتابوں میں مثالوں اور عبارتوں کی مکمل تشکیل نہ کی جائے

جب صرف ونحو کی تدریس کا اصل مقصد طلبہ کو اس فن کے قواعد اور معلومات کی عملی تربیت دینا اور مشق کرانا ہے تو پھر یہ ضروری ہے کہ اس تربیت اور مشق کا آغاز ان قواعد کی اپنی درسی کتاب سے کیا جائے اور زیرِ تعلیم بچوں کو اس کی مثالوں اور عبارتوں کی صحتِ نُطق اور صحتِ اعراب کے ساتھ پڑھنے کا اچھا موقع دیا جائے۔ اس لیے عربی زبان اور صرف ونحو کی درسی کتابوں کی عبارتوں کی مکمل تشکیل نہیں ہونی چاہیے' بلکہ ابتدائی درجوں کے بعد کے تعلیمی مرحلوں کی درسی کتابوں کی تشکیل تدریجاً کم کر دینی چاہیے تاکہ بچے خود اپنی محنت اور مشق سے



انہیں صحت کے ساتھ پڑھنے' لکھنے اور بولنے کی صلاحیت حاصل کریں اور ان میں خود اعتمادی پیدا ہو' اور وہ اپنی ذاتی جدّوجُہد اور مہارت کی بنیاد پر ترقی کریں۔

## حواشی

(۱) تاريخ الأدب العربي لأحمد حسن الزيات' ص ۲۹۰۔
(۲) كتاب النحو والصرف ـ المرحلة الثانوية الصف الثاني' ص ٦۔
(۳) ایضاً' ص ۷۔
(٤) ایضاً' ص ۷۔
(٥) پیش لفظ' تمرین الصرف' ص ٤' ٥۔
(٦) مقدمہ معلم الانشاء' حصہ اوّل' ص ۸۔۹۔

❁❁❁


تعلیم القرآن

عبدالرحمٰن صابر قرنیؒ

⇦ لفظی ومحاورۃ ترجمہ مع گرامر ⇦ جامع تشریح (حواشی میں اور آخر میں رکوع وار)

⇦ فہرست مضامین ⇦ مکمل لغات القرآن (تعلیم القرآن لغت جلد چہارم)

تعلیم القرآن لغت ایک مکمل لغات القرآن، قرآن اور قرآنی عربی سیکھنے والوں کیلئے نادر ونایاب تحفہ!

اس لغت میں قرآن کے تمام الفاظ کو حروف تہجی کے لحاظ سے بمع حوالۂ قرآن جمع کیا گیا ہے اور ہر لفظ کا مکمل ترجمہ ومفہوم مادہ ومصدر اور صرفی تشریح (گرامر کے قواعد) کے ساتھ دیا گیا ہے، نیز بلحاظ مادہ ومصدر بھی تمام الفاظ قرآنی کو جمع کیا گیا ہے۔

تعلیم القرآن مکمل سیٹ چار جلدوں میں قریباً ۳۸۰۰ صفحات پر مشتمل ہے
جس میں لغت بھی شامل ہے (جبکہ لغت کی جلد الگ سے بھی لی جاسکتی ہے)
ہدیہ مکمل سیٹ =/۱۶۵۰ روپے (=/۱۴۸۰ روپے میں بارعایت vpp طلب فرمائیں)

سائز 20×26/8 کتابت: کمپیوٹرائزڈ۔
طباعت = آفسٹ/سفید کاغذ
خوبصورت ۵ رنگی جلد

ادارہ تعلیم القرآن
19/C منصورہ' ملتان روڈ' لاہور 54570' پاکستان
Phone:042-35412949, 04235025227
Email: italeemulquran@yahoo.com, web: www.italeemulquran.net

# مسئلہ وحدتُ الوجود کی پیچیدہ گُتھّی اور اس کی آسان تفہیم

مولانا اشرف علی تھانویؒ

دراصل وحدۃ الوجود کا مطلب لوگوں نے سمجھا ہی نہیں۔ بعض ناواقفوں نے اس کو وحدت کے معنی منطقی پر محمول کیا ہے' حالانکہ اس میں صوفیہ نے محاورہ کا اتباع کیا ہے۔ محاورے میں یکتا و بے نظیر اس کو کہتے ہیں' جس کا ہمسر کوئی نہ ہو۔ کہتے ہیں ''فلان واحد فی الحسن واحد فی العلم'' وغیرہ۔ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ کوئی دوسرا حسین یا عالم مطلقاً ہے ہی نہیں؟ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس کے برابر کوئی نہیں۔ یہی مطلب وحدۃ الوجود کا ہے کہ خدائے تعالیٰ کے وجود کے برابر کسی کا وجود نہیں۔ وجودِ حقیقی اور کامل ایک ہی ہے اور دوسرے موجودات اس کے سامنے اس قابل نہیں کہ ان کو موجود کہا جا سکے۔ اگرچہ کسی درجہ میں وجودان کا بھی ہے اور یہ مضمون نصوص کے ذرا خلاف نہیں' بلکہ عین مطابق ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ﴾ (ذاتِ خداوندی کے سوا ہر شے ہلاک ہونے والی ہے) اس کی ایک تفسیر تو مشہور ہے' یعنی هالك فی الاستقبال اور ایک تفسیر اس کی وہی ہے جو صوفیہ کی ہے' یعنی هالك فی الحال (ہلاک ہونے والی ہے' فی الوقت بھی) اور یہ تفسیر صاحب شرح عقائد نے بھی لکھی ہے' شرح عقائد میں جس کا جی چاہے دیکھ لے۔ مجھے چونکہ صوفیہ محقّقین سے محبت ہے' اس لیے میں ان کی تائید کی تلاش میں رہتا ہوں اور ڈھونڈنے والا ہر جگہ سے اپنا مطلب نکال لیتا ہے' اس لیے میں نے اہلِ ظاہر کی کتابوں ہی سے تائید نکال لی۔ اب علمائے ظاہر جو صوفیہ پر اعتراض کرتے ہیں' وہ شارح عقائد پر بھی فتویٰ لگائیں' مگر اس کو سب پڑھتے اور کوئی اعتراض نہیں کرتا اور صوفیہ پر اعتراض کیا جاتا ہے۔

جہلاء صوفیہ کی تو ہم بھی حمایت نہیں کرتے' مگر محققین کس معنی کے وحدۃ الوجود کے قائل



ہیں' اس پر کیا حق اعتراض کا ہے؟ پس خوب سمجھ لو کہ وحدۃ الوجود کا یہ مطلب نہیں کہ کسی شے کا وجود ہے ہی نہیں' بلکہ مطلب یہ ہے کہ وجود تو اغیار کا بھی ہے' مگر کالعدم ہے' جیسے ستارے دن میں موجود تو ہوتے ہیں' جس کو اہلِ علم جانتے ہیں' مگر آفتاب کے سامنے کالعدم ہوتے ہیں۔ نیز اس کی ایسی مثال ہے' جیسے ایک تحصیلدار چپراسی پر حکومت کرتا ہے اور اس وقت وہ حاکم معلوم ہوتا ہے' مگر وائسرائے کے سامنے بول بھی نہیں سکتا' اس وقت اس کی حکومت کالعدم ہو جاتی ہے۔ نیز ایک ماہرفن قاری کے سامنے ایک طفل مکتب کو کوئی قاری نہیں کہتا' گو کسی قدر قراءت اس نے بھی پڑھی ہو' مگر ماہرفن کے سامنے اس کو کوئی قاری کہے تو شرم سے گڑ جائے گا' ہاں کوئی بے حیا ہو تو اور بات ہے۔ جیسے لکھنؤ میں ایک بچے نے ایک عرب کے لب ولہجہ کی نقل اتاری تھی' بعض بچے نقّال بہت ہوتے ہیں' تو عوام یہ سمجھتے ہیں کہ یہ بھی عرب صاحب کے برابر پڑھنے لگا ہے' کیونکہ عوام کو فن کی کیا خبر وہ تو لب ولہجہ ہی کو قراءت سمجھتے ہیں' تو بعض جاہل اس لڑکے کو عرب صاحب کے پاس لے گئے اور یہ ظاہر کرنا چاہا کہ یہ قراءت میں آپ کے برابر ہو گیا ہے' مگر ادباً کہا کہ حضرت اس لڑکے نے جناب کی کچھ تقلید کی ہے' متبرّکاً اس کا کچھ قرآن سن لیا جائے۔ انہوں نے سن لیا اور سن کر خاموش رہے' نہ کچھ مدح کی اور نہ مذمّت کی۔ لوگوں نے پوچھا کہ حضرت اس نے کیسا پڑھا؟ فرمایا ایسا پڑھا جیسا ہم نے ایک آمدنامہ تصنیف کیا تھا' جس کے چند جملے یہ ہیں الخیار ککڑی' العنکبوت مکڑی' الحطب لکڑی۔ تو جیسی یہ ہماری اردو ہے ایسے ہی اس بچے کی قراءتِ قرآن ہے' غرض محاورات میں ناقص کو کامل کے سامنے لاشے اور کالعدم سمجھا جاتا ہے اور یوں ہی کہا جاتا ہے کہ بس قاری تو فلانا ہے' سخی تو وہ ہے' حسین تو یہ ہے۔ اور ناقص سے بالکلیہ اس کی نفی کرتے ہیں' مگر مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ کامل کے سامنے کوئی چیز نہیں' یہ معنی نہیں کہ فی نفسہ بھی کچھ نہیں۔ یہی مطلب ہے محققین کا وحدۃ الوجود سے کہ حق تعالیٰ کے وجود کے سامنے کسی کا وجود کچھ نہیں' کسی درجہ میں قابلِ ذکر نہیں۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مطلب کو خوب ہی ادا فرمایا ہے:

یکے قطرہ از ابرِ نیساں چکید — خجل شد چو دریائے پنہاں بدید
کہ جائے کہ دریاست بسی کیستم — گر او ہست حقا کہ من نیستم

ترجمہ: ایک قطرہ بارش کا ابر نیساں سے ٹپکا' جب بڑا دریا دیکھا تو شرمندہ ہو گیا کہ جہاں اتنا بڑا دریا ہے' بھلا میں کون ہوں۔ اس کی ہستی کے سامنے گویا نیست ہوں۔

پھر فرماتے ہیں:

ہم ہرچہ ہستند ازاں کمتر اند  کہ باہستیش نامِ ہستی برند

ترجمہ: جو بھی موجود ہیں‘ اس سے کم ہیں۔ اس لیے کہ اس کی ہستی کی بدولت ہی موجود ہوئے ہیں۔

باقی یہ مطلب نہیں ہے کہ حق تعالیٰ کے سوا فی نفسہ کسی درجہ میں بھی کوئی موجود نہیں‘ کیونکہ حق تعالیٰ خالق ہیں اور خلق کے معنی اعطائے وجود ہیں‘ اور یہ کیونکر ہوسکتا ہے کہ حق تعالیٰ تو موجود کریں اور تم موجود نہ ہو‘ یہ تو محالات میں سے ہے۔ اس کی تو وہی مثال ہوگی کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو طلاق دی تو عورت کہتی ہے‘ چاہے تو کتنی ہی طلاق دے میں تو لیتی ہی نہیں۔ سوچیے اس عورت کو سب لوگ بیوقوف کہتے ہیں‘ کیونکہ طلاق دینے کے بعد کسی سے لینے کی ضرورت نہیں‘ وہ تو خود بخود واقع ہو جاتی ہے۔ اسی طرح وہ لوگ بھی بیوقوف ہیں جو حق تعالیٰ کو خالق مان کر پھر مخلوق کو موجود نہیں مانتے۔ مخلوق کا وجود ضرور ہے‘ مگر وجود ضعیف اور اعتباری اور برائے نام ہے۔ پس خوب سمجھ لو کہ محققین ممکنات سے مطلقاً نفی وجود نہیں کرتے‘ بلکہ وجود حقیقی کامل کے سامنے ان کے وجود کو کالعدم اور لاشئ سمجھتے ہیں‘ اسی لیے ان کا قول ہے کہ وحدۃ الوجود تو ایمان ہے اور اتحادِ وجود کفر ہے۔ کیونکہ اوّل تو اتحادِ طرفین کے وجود کو مستلزم ہے‘ اور غیر حق کا وجود ہے کہاں جو وہ وجودِ حق سے متّحد ہو۔ دوسرے اتّحاد بین الاثنین محال عقلی ہے‘ اور محال عقلی کا اعتقاد جناب باری میں کفر ہے‘ اور اگر کسی کے کلام میں اتحاد وارد ہے تو معقول کی اصطلاح پر نہیں‘ اس کا استحالہ تو ابھی مذکور ہوا‘ بلکہ عوام کے محاورے پر ہے‘ تو ان حضرات نے اصطلاحِ عوام و اصطلاحِ فلسفہ کو خلط کر دیا ہے۔ کہیں وہ جو چاہیں‘ وہ کہیں‘ اب کوئی ان کی باتوں کو کیا سمجھے‘ خاک پتھر۔ کیونکہ عوام کے محاورے میں اتحادِ وجود کے لیے طرفین کی عینیت لازم نہیں‘ بلکہ وہ منفصل چیزوں کو بھی متحد کہہ دیتے ہیں‘ مثلاً کہا کرتے ہیں کہ میاں ہم اور تم تو متحد ہیں‘ اس میں عینیت طرفین اور جس اتحاد وجود کو محققین نے کفر کہا ہے‘ اس میں عینیت طرفین ملحوظ ہے اور یہ خاص اہل فلسفہ کی اصطلاح ہے۔ اسی لیے صوفیہ کے کلام کو سمجھنے کے لیے صحبتِ محقّق کی ضرورت ہے۔ بہرحال جب ان کے نزدیک اتحادِ وجود عین کفر ہے تو اب آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ محققین کے قول میں اور جہلاء کے اس قول میں کہ ہر چیز میں خدا ہے‘ کتنا فرق ہے؟ وہ تو کسی شے کو موجود کہنے کے قابل بھی نہیں سمجھتے اور یہ ظالم ہر چیز کو خدا کہتے ہیں۔ نعوذ باللہ — اور یہ جو بعض صوفیہ سے ہمہ اوست صادر ہوا ہے یہ غلبۂ حال ہے‘ جس کی حقیقت یہ ہے کہ جب سالک پر محبت حق کا غلبہ ہوتا ہے تو اس کے ادراک سے بجز ذاتِ حق کے



ہر شے نکل جاتی ہے‘ جیسا کہ عاشقانِ مجاز کو بھی یہ حال پیش آتا ہے۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی عجیب مثال لکھی ہے:

اگر دیدہ باشی کہ در باغ و راغ  بتابد یکے کرمکے چوں چراغ

کسے گفتش اے کرمکِ شب فروز  چہ بودت کہ بیروں نیائی بروز؟

کسی نے جگنو سے کہا جو رات میں چراغ کی طرح چمکتا ہے کہ میاں تم دن میں کہاں رہتے ہو؟

نہ بینی کہ آن کرمک خاک زاد  جواب از سر روشنائی چہ داد

تمہیں خبر نہیں کہ اس خاک کے کیڑے نے جواب عقلمندی سے کیا دیا:

کہ من روز و شب جز بصحرا نیم  ولے پیش خورشید پیدا نیم

اُس نے کہا میں تو جنگل ہی میں رہتا ہوں‘ مگر آفتاب کے سامنے ظاہر نہیں ہوسکتا۔

اسی طرح جن لوگوں کی نظر آفتابِ وجودِ حقیقی پر ہوتی ہے‘ اس وقت جگنو یعنی اشیائے عالم کا وجود ان کو نظر نہیں آتا۔ ہاں جو لوگ اندھیرے میں ہیں‘ جن کی نظر سے آفتاب وجود حقیقی غائب ہے‘ وہ البتہ اشیائے عالم کے وجود پر نظر رکھتے ہیں‘ اور جو محقّق ہیں جو کہ مغلوب الحال نہیں ہیں‘ ان کی نظر آفتاب وجود حقیقی پر ہونے کے ساتھ مخلوق پر بھی ہوتی ہے‘ ان کی مثال ایسی ہے جیسے بعض لوگ تیز نظر ہیں کہ دن میں ستارے دیکھ لیتے ہیں‘ ایسے ہی یہ باطن کے تیز نظر ہیں۔

❁❁❁


رمضان المبارک کا بہترین تحفہ

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کی مقبول عام تالیف

مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق

خود پڑھئے اور دوستوں اور عزیزوں کو تحفتاً پیش کیجئے!

دورانِ ماہِ رمضان اہل وعیال اور عزہ واقارب کے ساتھ اجتماعی مطالعہ کیجئے!

اشاعت خاص: 45 روپے  اشاعت عام: 25 روپے

# مبشّرات اور علمِ غیب

ڈاکٹر ایم اے اقبال

جب مبشّرات کی بات کی جاتی ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے رحمانی خواب۔ خواب کی تین قسمیں ہیں: (۱) رحمانی (۲) نفسانی (۳) شیطانی۔

## (۱) رحمانی خواب

خواب کی پہلی قسم وہ ہے جنہیں رحمانی یا روحانی خواب یا رؤیائے صادقہ کہتے ہیں۔ انہی کو مبشرات (خوشخبریاں) بھی کہا جاتا ہے اور جدید علم الخواب میں انہیں دُور خیال خواب (telepathic dreams) کہتے ہیں۔ یہ ایسے خواب ہوتے ہیں جن میں کسی قسم کی بشارت ہو' اللہ تعالیٰ کی رضا کے کاموں کی ترغیب دی گئی ہو' ارضِ مقدس کی زیارت ہو' غرضیکہ دل کو بھلے محسوس ہوں اور جاگنے کے بعد بھی اُن کا سرور اور حلاوت محسوس ہوتی رہے۔ ایسے خواب اس لیے دکھائے جاتے ہیں کہ بندہ محظوظ ہو اور طلبِ حق اور محبتِ الٰہی میں اور زیادہ سرگرمِ عمل ہو۔ ایسے خواب قابلِ تعبیر ہیں اور ان پر بڑے اہم نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ ایسے خواب عموماً واضح اور بغیر رموز کے ہوتے ہیں۔ حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

((اِذَا رَأَی اَحَدُکُمُ الرُّؤْیَا یُحِبُّهَا فَاِنَّهَا مِنَ اللّٰهِ فَلْیَحْمَدِ اللّٰهَ عَلَیْهَا وَلْیُحَدِّثْ بِهَا' وَاِذَا رَأَی غَیْرَ ذٰلِكَ مِمَّا یَکْرَهُ فَاِنَّمَا هِیَ مِنَ الشَّیْطٰنِ فَلْیَسْتَعِذْ مِنْ شَرِّهَا وَلَا یَذْکُرْهَا لِاَحَدٍ فَاِنَّهَا لَنْ تَضُرَّهٗ))(۱)

''جب تم میں سے کوئی خواب میں خوش کن شے دیکھے تو وہ اللہ کی طرف سے ہے۔ پس اسے چاہیے کہ وہ اس پر الحمدللہ کہے اور اس خواب کو بیان بھی کرے۔ اور جب کوئی ناپسندیدہ چیز دیکھے تو وہ شیطان کی طرف سے ہے۔ پس اسے چاہیے کہ وہ اس کے شر سے پناہ مانگے اور اس کا ذکر کسی سے نہ کرے۔ (اس طرح وہ خواب) اسے ہرگز



نقصان نہیں پہنچائے گا۔''

یہ رحمانی خواب زیادہ تر اوقاتِ سحر میں آتے ہیں اور روایات میں آتا ہے کہ جو خواب سحری کے وقت دیکھے جائیں وہ سچے اور قابل تعبیر ہوتے ہیں۔ حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((اَصْدَقُ الرُّؤْیَا بِالْاَسْحَارِ))(۲)

''سب سے سچے خواب اوقاتِ سحر میں دیکھے جانے والے ہوتے ہیں۔''

## (۲) نفسانی خواب

ایسے خواب ہمارے دن بھر کے کام کاج کا عکس ہوتے ہیں۔ دن بھر کی مصروفیات کے غیر حل شدہ معاملات ذہن کے لاشعور گوشے میں جمع ہوتے رہتے ہیں اور رات کو خواب کی صورت میں دہرائے جاتے ہیں۔ ایسے خواب جن میں مختلف لوگوں سے میل ملاقاتیں ہوں' یا مختلف مقامات کی سیر ہو' یا کسی سے کسی بات پر اختلاف اور لڑائی جھگڑا ہو' ایسے خواب اسی نوعیت کے خواب شمار ہوتے ہیں۔ عام طور پر ایسے خوابوں کی کوئی تعبیر بھی نہیں ہوتی ہے۔

## (۳) شیطانی خواب

ایسے خواب جن کے دیکھنے کے بعد بھی خوف محسوس ہوتا رہے' دل کی دھڑکنیں بے قابو رہیں' بدن پسینے سے شرابور رہے' یا وہ خواب جن سے کراہیت کا پہلو نکلتا ہو یا کپڑے پلید ہو جاتے ہوں' اس نوعیت کے تمام خواب شیطان کی طرف منسوب کیے گئے ہیں اور انہیں شیطانی خواب سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص ایسا خواب دیکھے تو وہ بیدار ہونے کے بعد شیطان اور اس کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرے تو وہ خواب اسے نقصان نہیں پہنچائے گا۔ حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

((اَلرُّؤْیَا مِنَ اللّٰهِ وَالْحُلْمُ مِنَ الشَّیْطَانِ' فَاِذَا رَأَی اَحَدُکُمْ شَیْئًا یَکْرَهُهٗ فَلْیَنْفِثْ حِیْنَ یَسْتَیْقِظُ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ وَیَتَعَوَّذْ مِنْ شَرِّهَا فَاِنَّهَا لَا تَضُرُّهٗ))(۳)

''رؤیا (اچھا خواب) اللہ کی طرف سے ہے اور حُلم (بُرا خواب) شیطان کی طرف سے ہے۔ جب تم میں سے کوئی (خواب میں) ناپسندیدہ چیز دیکھے تو نیند سے بیدار ہونے کے بعد تین بار تھوکے اور اس کے شر سے پناہ مانگے تو وہ (خواب) اسے نقصان نہیں پہنچائے گا۔''

خواب کی اس تقسیم سے ظاہر ہے کہ خوابوں کی تمام اقسام صحیح' قابلِ تعبیر اور درخورِ التفات نہیں ہوتیں' بلکہ تعبیر اور اعتبار کے لائق خواب کی صرف وہی قسم ہے جن میں حق تعالیٰ کی جانب سے بشارت و اعلام ہو۔

## علم اور علمِ غیب

جب علم کا ذکر ہوتا ہے تو اس کی دو قسمیں سامنے آتی ہیں' ایک وہ علم جو ہم درس گاہوں میں حاصل کرتے ہیں اور دوسرا وہ علم جو براہِ راست پڑھایا جاتا ہے' اس کے لیے نہ کسی مدرسے کی ضرورت ہے اور نہ ہی کسی سکول' کالج یا یونیورسٹی کی۔ یہ ایک پوشیدہ علم ہے جس کو قرآن مجید نے علمِ غیب سے تعبیر فرمایا ہے اور اس پر ایمان لانا ہر مسلمان کے لیے لازم قرار دیا گیا ہے۔ یہ وہ علم ہے جس کو نہ انسانی عقل پا سکتی ہے اور نہ ہی ظاہری و باطنی حواس۔ یہ علم سارے علوم پر غالب ہے اور تحصیل و کسب سے اس کا کوئی تعلق نہیں' یہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بارش کی طرح برستا ہے اور چشمے کی طرح اُبلتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے مقرّب بندوں کو اِس علم سے نوازتا ہے۔

قرآن حکیم میں بہت سی آیات میں علم غیب کا ذکر ہے' جن میں سے چند ایک کو یہاں بیان کیا جا رہا ہے۔ سورۃ البقرۃ میں فرمایا:

﴿اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ غَیۡبَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۙ وَاَعۡلَمُ مَا تُبۡدُوۡنَ وَمَا کُنۡتُمۡ تَکۡتُمُوۡنَ ﴿۳۳﴾﴾

''میں خوب جانتا ہوں چھپی ہوئی چیزیں آسمانوں کی اور زمین کی اور میں (وہ بھی) جانتا ہوں جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم چھپاتے ہو۔''

سورۂ آل عمران میں فرمایا:

﴿ذٰلِکَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ الۡغَیۡبِ نُوۡحِیۡہِ اِلَیۡکَ ؕ﴾ (آیت ۴۴)

''یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم تیری طرف وحی کرتے ہیں۔''

اِن آیات سے معلوم ہوا کہ علمِ غیب صرف اللہ ہی کے لیے مختص ہے۔ کوئی بھی از خود یہ علم حاصل نہیں کر سکتا اور نہ بغیر عطائے الٰہی کے کسی کے پاس یہ علم آ سکتا ہے۔ البتہ غیب کی چند چیزوں کی خبر اللہ تعالیٰ اپنے برگزیدہ بندوں کو دے دیتے ہیں۔ مثلاً قرآن میں حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارے میں آتا ہے کہ اللہ نے ان کو علم غیب کی چند باتیں الہام کی تھیں۔ سورۂ



یوسف میں فرمایا:

﴿قَالَ اَلَمۡ اَقُلۡ لَّکُمۡ اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ مِنَ اللّٰہِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۹۶﴾﴾ (یوسف)

''(یعقوبؑ نے) کہا: کیا میں نے تم کو یہ نہیں کہا تھا کہ میں اللہ کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔''

واقعہ یہ ہے کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی حضرت یوسفؑ کی دی ہوئی قمیص لے کر چلے تھے تو حضرت یعقوب علیہ السلام کو پتا چل گیا تھا' کیونکہ اس پر انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مطلع فرما دیا گیا تھا۔ ورنہ جب بھائیوں نے یوسف علیہ السلام کو کنویں میں پھینک دیا اور تقریباً مارنے کی سازش کی تو یعقوب علیہ السلام کو پتا نہ چل سکا کہ وہ کنویں میں پڑے ہوئے ہیں۔ پھر حضرت یوسف علیہ السلام قافلے والوں کے غلام بنے' بازارِ مصر میں بکتے رہے' اُن پر بولیاں لگتی رہیں' قمیصیں پھٹتی رہیں' جیل جاتے رہے اور ان کے والد حضرت یعقوب علیہ السلام شام میں بیٹھے ہوئے ہیں' لیکن بیٹے کے حالات و واقعات سے لاعلم ہونے کی وجہ سے بیٹے کی مدد نہیں کر پا رہے ہیں۔

## رؤیائے صادقہ پیشین گوئیوں کا باعث

یہاں یہ بات ذہن میں مستحضر رہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں' انبیاء کرام اور برگزیدہ بندوں کو علمِ غیب عطا فرماتا ہے لیکن صرف اتنا' جتنا وہ چاہتا ہے اور اس کا ایک ذریعہ یہی خواب ہیں۔ رؤیائے صادقہ کے ذریعے اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو آنے والے واقعات سے باخبر رکھتا ہے۔ ان خوابوں میں عموماً بشارتیں ہوتی ہیں اور بسا اوقات ناخوشگوار حادثات بھی ہوتے ہیں۔ اِن کی تعبیر کبھی تو مِن و عَن ہوتی ہے اور خواب میں دیکھے ہوئے واقعات بالکل اسی طرح رونما ہو جاتے ہیں یا پھر ان کی تعبیر رمزی ہوتی ہے۔ سچا خواب اس لیے دکھایا جاتا ہے کہ اللہ اپنے بندے کو غیب سے مطلع کرنا چاہتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کا محبوب بندہ طلبِ حق اور محبتِ الٰہی میں اور زیادہ سرگرم عمل ہو۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (حجرۂ مبارک کا) پردہ اٹھایا جبکہ لوگ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پیچھے (نماز کے لیے) صفیں باندھے ہوئے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((اَیُّھَا النَّاسُ اِنَّہٗ لَمۡ یَبۡقَ مِنۡ مُبَشِّرَاتِ النُّبُوَّۃِ اِلَّا الرُّؤۡیَا الصَّالِحَۃُ یَرَاھَا الۡمُسۡلِمُ اَوۡ تُرٰی لَہٗ)) (۴)

''اے لوگو! سچے خوابوں کے علاوہ مبشّراتِ نبوّت میں سے کچھ باقی نہیں رہا' جن کو

مسلمان دیکھتا ہے یا اس کو دکھایا جاتا ہے۔''

آسمانی کتب اور صحیفوں میں حضرت ابراہیمؑ، حضرت یعقوب اور حضرت یوسف علیہم السلام اور ان کے علاوہ مشہور لوگوں کے اہم خواب ذکر کیے گئے ہیں، جن کا اُن کے مستقبل سے گہرا تعلق تھا۔ یہ خواب ان کی سچائی اور نبوت کو سچ ثابت کرنے والی پیشین گوئیاں تھیں اور اپنی فطرت میں پیغمبرانہ خواب تھے۔ جب کوئی نیک بندہ کسی مشکل میں پھنس جاتا ہے اور ظاہراً کوئی حل سمجھ میں نہیں آ رہا ہوتا تو اچانک سوتے میں خواب کے ذریعہ رہنمائی کی جاتی ہے کہ ایسے کیا جائے تو مسئلہ حل ہو جائے گا اور پھر ویسے ہی ہوتا ہے۔ روئے زمین پر شاید ہی ایسا کوئی شخص موجود ہو جس نے کبھی کوئی خواب نہ دیکھا ہو اور اس خواب نے اس کی فکر یا تصور کو متاثر نہ کیا ہو۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ سچے خواب (رؤیائے صادقہ) مستقبل کے بارے میں پیشین گوئیاں کرتے ہیں اور مشکلات میں ہماری مدد کرتے ہیں۔

## اللہ کا علم اور لوحِ محفوظ

یہ پیشین گوئیاں خالق حقیقی کی طرف سے افشائے غیب اور مشکلات کا حل ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہماری شہ رگ سے بھی قریب ہے، ورنہ کیسے ممکن تھا کہ ہم التجا کریں اور تکلیف رفع ہو جائے۔ یہ مضبوط رابطہ، شعورِ اعلیٰ کے توسط سے اللہ سے قائم رہتا ہے۔ ہر ایک کا شعور اور لاشعور انفرادی طور پر عمل کے ذمہ دار ہیں جبکہ سب انسانوں کے شعور اعلیٰ کا منبع وہ ذات وحدہٗ لاشریک ہے، جو سب کو نوازتا ہے، یہ فرق کیے بغیر کہ کون فرمانبردار ہے، کون نافرمان۔

اللہ تعالیٰ علیم ہے، جو ہر بات کا جاننے والا ہے، اس کے علم کا احاطہ ممکن نہیں۔ ارشاد ہے:

﴿وَفَوْقَ كُلِّ ذِیْ عِلْمٍ عَلِیْمٌ﴾ (یوسف)

''تمام علم والوں سے بڑھ کر ایک بڑا علم والا ہے۔''

اُسی نے آدم علیہ السلام کو اس کائنات کا علم دیا اور اس علم کے بارے میں فرمایا:

﴿وَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا﴾ (بنی اسرائیل)

''اور (اے بنی نوعِ انسان) تم کو تھوڑا سا علم دیا گیا ہے۔''

جو تھوڑا سا علم حضرت آدم علیہ السلام کو ملا اس کا مشاہدہ اس کائنات کی ترقی کی صورت میں ہماری نظروں کے سامنے ہے اور اس سے اللہ تعالیٰ کے علم کی وسعت کا اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے۔ جب اللہ جل جلالہ نے چاہا کہ وہ اپنے علم، طاقت اور عظمت کے لیے پہچانا جائے تو اس



نے یہ کائنات تخلیق کی، حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا اور ان کو شعور عطا فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کے لیے یہ کوئی بڑی بات نہ تھی۔ اُس نے فرمایا: کُنْ اور سب کچھ پلک جھپکتے ہو گیا۔ تب اللہ تعالیٰ کے علم اور قدرت سے کائنات کے بارے میں سب کچھ لوحِ محفوظ پر ظاہر ہو گیا۔

ہمارا شعورِ اعلیٰ اسی لوحِ محفوظ کا عکس ہے۔ اس میں دنیا کی اور یہاں رہنے والوں کی ہر طرح کی معلومات موجود ہیں۔ جب کوئی اپنے آپ کو پہچاننا چاہتا ہے تو وہ شعورِ اعلیٰ میں اپنا عکس دیکھتا ہے اور وہاں پر اُسے دنیا کا مقصد اور اپنی حقیقت دکھائی دے جاتی ہے۔ لوحِ محفوظ کے لکھے کو سمجھنے اور اس پر عمل کے لیے ضروری ہے کہ ہمیں اس کی زبان آتی ہو۔ چونکہ ہمارا شعورِ اعلیٰ، لوحِ محفوظ کا عکس ہے اس لیے ضروری ہے کہ ہم اسے سمجھ لیں اور شعورِ اعلیٰ سے روابط بڑھائیں۔

## مراقبہ

انسان کی ایک دنیا یہ عالمِ زمان و مکان ہے اور دوسری اس کے قلب (دل و دماغ) کی دنیا ہے۔ اس کو ان دونوں عالموں میں رہنا پڑتا ہے۔ وہ نہ تو داخلی دنیا سے باہر نکل سکتا ہے اور نہ ہی خارجی دنیا سے۔ جب یہ دونوں جہاں اس کے ہیں اور وہ ان میں رہنے پر مجبور ہے تو اسے اپنے جمالیاتی تقاضوں کی تشفی کے لیے ان دونوں جہانوں کو خوبصورت بنانا ناگزیر ہے۔ انسان کی یہ سچی آرزو ہے جس کے پورا کرنے میں اس کی اپنی ذات کی تکمیلِ مسلسل کا راز مضمر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو شعور عطا فرمایا ہے لیکن قلب کی دنیا کو خوبصورت بنانے کے لیے اس کا قرب اور اس کے علم سے مزید کچھ حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ اس مزید علم کو حاصل کرنے کے لیے مراقبہ کا عمل مفید ہے۔ بعثت سے قبل رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ آپؐ غارِ حرا تشریف لے جاتے تھے اور مسلسل کئی کئی روز مراقبہ فرماتے تھے۔ جتنا اللہ تعالیٰ کے علم سے آگاہی ہوتی جاتی تھی، اتنے ہی آپؐ کے معمولات طویل تر ہوتے جاتے تھے، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو بعثت سے سرفراز فرمایا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا آغاز رؤیائے صادقہ سے ہوا۔ اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں:

اَوَّلُ مَا بُدِئَ بِهٖ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم مِنَ الْوَحْيِ الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ [وَفِیْ رِوَايَةٍ: الرُّؤْيَا الصَّادِقَةُ] فِی النَّوْمِ، فَكَانَ لَا يَرٰى رُؤْيَا اِلَّا جَاءَتْ مِثْلَ فَلَقِ

الصُّبْحِ(۵)

''شروع شروع میں رسول اللہ ﷺ پر وحی نیند کی حالت میں سچے خوابوں کی صورت میں آتی تھی۔ پس آپؐ جو خواب دیکھتے وہ سپیدۂ سحر کی طرح رونما ہو جاتا تھا۔''

مراقبہ‘ ہمارے بزرگوں اور مشائخ اسلام کا بھی معمول رہا ہے۔ نماز اور روزے سے بھی اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے‘ لیکن جو توجّہ اور ارتکاز (concentration) مراقبہ سے حاصل ہوتا ہے‘ وہ انسان کو عرش کی بلندیوں پر لے جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے قرب کا ذریعہ بنتا ہے۔ مراقبہ سے شعورِ بالا یا شعورِ اعلیٰ سے آگاہی ہوتی ہے۔ جو باتیں یا علم ہمیں بہت محنت اور تگ و دو سے حاصل ہونا ہوتا ہے‘ وہ مراقبے کے ذریعے تھوڑی سی جِدّوجُہد اور مختصر سی مدت میں حاصل ہو جاتا ہے۔ خوابوں کے ذریعہ ہم اپنے لاشعور سے ہم کلام ہوتے ہیں اور شعورِ اعلیٰ سے اچھی خوشخبریوں کی توقع کرتے ہیں۔ مراقبہ کا خوابوں پر فوری اثر ہوتا ہے کہ پیشین گوئیوں والے (سچے) خواب کثرت سے دکھائی دینے لگتے ہیں۔

## استخارہ

اپنے کاموں کی تکمیل کے لیے اللہ تعالیٰ سے درخواست بھی کی جاتی ہے‘ اس کو استخارہ کہتے ہیں۔ کسی کام کو شروع کرنے سے پیشتر اس کام کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے مشورہ کرنا‘ اس کی رائے معلوم کرنا‘ استخارہ کہلاتا ہے۔ یہ سنت عمل ہے اور نبی کریم ﷺ نے استخارے کے لیے خاص تاکید فرمائی ہے کہ کوئی بھی اہم کام کرنے سے پیشتر استخارہ کیا جائے۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ میں نے استخارہ کیا تو اس سے مراد اللہ تعالیٰ کے اُن آداب کا لحاظ رکھنا ہے‘ جن کا حکم اس نے اپنے پیغمبر ﷺ اور ان کے اتباع کرنے والوں کو دیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴿۹۸﴾﴾ (النحل) ''جب قرآن پڑھنے لگو تو شیطان مردود سے اللہ کی پناہ مانگ لیا کرو''۔ اس ضمن میں تین طرح کے الفاظ آتے ہیں: (۱) استعاذہ‘ شیطان سے اللہ کی پناہ مانگنا (۲) استخارہ‘ اللہ سے بھلائی طلب کرنا اور (۳) استعانہ‘ ہر معاملے میں اللہ تعالیٰ کی مدد چاہنا۔ ان تینوں کا حاصل یہی ہے کہ تمام امور میں اللہ تعالیٰ ہی سے مدد طلب کی جائے‘ اپنے تمام کاموں کو اللہ ہی کے سپرد کیا جائے اور اس طریقہ سے ہر طرح کی مصیبتوں سے نجات حاصل کی جائے۔ جب انسان اس حقیقت سے روشناس ہو جائے کہ کسی کام میں اس کی کامیابی‘ اس کی محنت اور تدبیر پر موقوف نہیں تو اس کے



لیے اللہ کے فیصلوں پر راضی ہونے اور اس سے مدد مانگنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہتا۔ اس طرح وہ نفسِ امارہ کی شرارتوں اور اور سرکشی سے محفوظ ہو جاتا ہے اور اس کو اصلاح اور بہتری کی نعمت حاصل ہوتی ہے۔

استخارہ کرنے کی صورت میں بھی بالعموم خواب ہی نظر آتا ہے‘ چاہے موافق ہو یا مخالف۔ یعنی استخارے کا جواب بھی خواب ہی کی صورت میں وصول ہوتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ استخارے کا خواب اس خاص کام سے متعلق ہوتا ہے جو درپیش ہے اور جس کے کرنے یا باز رہنے کی ہدایت طلب کی گئی ہے‘ جبکہ خواب عام ہوتا ہے جس میں کچھ بھی ہو سکتا ہے‘ یعنی رحمانی خواب بھی ہو سکتا ہے‘ شیطانی خواب بھی اور نفسانی خواب بھی۔

## اسلام میں خوابوں کی اہمیت اور مقام

خوابوں کی اہمیت اور اسلام میں ان کے مقام کے بارے میں ارشادِ نبوی ملاحظہ ہو۔ حضرت انس بن مالک ؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَلرُّؤْيَا الْحَسَنَةُ [وَفِيْ رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ: اَلرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ] مِنَ الرَّجُلِ الصَّالِحِ جُزْءٌ مِنْ سِتَّةٍ وَاَرْبَعِيْنَ جُزْءًا مِنَ النُّبُوَّةِ))(۶)

''نیک آدمی کا اچھا خواب (نیک خواب) نبوت کے چھیالیس اجزاء میں سے ایک جزء ہے۔''

خواب کی اہمیت سے متعلق ایک روایت حضرت ابوہریرہ ؓ سے مروی ہے‘ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا:

((لَمْ يَبْقَ مِنَ النُّبُوَّةِ اِلاَّ الْمُبَشِّرَاتُ)) قَالُوْا : وَمَا الْمُبَشِّرَاتُ؟ قَالَ: ((اَلرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ))(۷)

''نبوت میں سے کچھ باقی نہیں رہے گا سوائے مبشّرات کے۔'' صحابہ نے عرض کیا: مبشّرات کیا ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''نیک خواب۔''

یعنی جب نبوت نہ ہو گی تو مؤمنین کا اللہ تعالیٰ سے تعلق مبشّرات (یعنی رؤیائے حق) کے ذریعے ہو گا‘ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہامِ ربانی اور کشفِ روحانی و باطنی سے عبارت ہوتے ہیں۔ اور یہ اسی صورت میں حاصل ہوتے ہیں جب بندے کا باطن پاک ہو اور اس کا قلب تمام رذائل سے خالی ہو۔ اس صورتِ حال میں یہ رؤیائے صالحہ اس کے لیے نور و روشنی کا باعث بن

جاتے ہیں' اس دنیا میں راہِ ہدایت دکھاتے ہیں اور ایسے مخفی امور اس پر منکشف ہو جاتے ہیں جن کا علم اس کے لیے نفع و خیر کا باعث ہوتا ہے۔ اسی لیے رؤیائے صالحہ نیک بندوں کی ہدایت کے لیے سبیل اور معرفتِ الٰہی کی دلیل ہوتے ہیں' لیکن یہ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ یہ رؤیائے صالحہ مصائب و شدائد کے وقت انسان کے لیے مددگار اور نا امیدی کے وقت تمکین و قوت کا ذریعہ بھی ہوتے ہیں۔ ہمارے لیے یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ خواب کتنے طاقتور ہوتے ہیں' ہم اِن سے کیا کام لے سکتے ہیں' اور اگر خواب دکھائی نہ دیں تو ہماری زندگی پر کیا بُرے اثرات پڑ سکتے ہیں؟ اس اہم موضوع پر کسی نے خوابوں کو اس زاویے سے دیکھنے اور قلم اُٹھانے کی کوشش نہیں کی۔

خواب کی شرعی حیثیت اور دین میں اس کا مقام کے بارے میں تفسیرِ مظہری میں حضرت قاضی ثناء اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

''خواب یہ ہے کہ نفسِ انسانی جس وقت نیند یا بیہوشی کے سبب ظاہر بدن کی تدبیر سے فارغ ہو جاتا ہے تو اس کی قوتِ خیالیہ کی راہ سے کچھ صورتیں دکھائی دیتی ہیں' اسی کا نام خواب ہے۔ پھر اس کی تین قسمیں ہیں جن میں سے دو بالکل باطل ہیں' جن کی کوئی حقیقت اور اصلیت نہیں ہوتی اور ایک اپنی ذات کے حساب سے صحیح اور صادق ہوتی ہے۔''(۸)

خواب میں انسان جو مختلف صورتیں اور واقعات دیکھتا ہے' ان کے بارے میں یہ یاد رکھیں کہ کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ انسان بیداری کی حالت میں جو صورتیں دیکھتا ہے وہی خواب میں متشکل ہو کر آ جاتی ہیں اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ شیطان کچھ صورتیں اور واقعات اس کے ذہن میں ڈالتا ہے' کبھی خوش کرنے والے اور کبھی ڈرانے والے' یہ دونوں قسمیں باطل ہیں' جن کی نہ کوئی حقیقت و اصلیت ہے نہ اس کی کوئی تعبیر ہو سکتی ہے۔

ان میں پہلی قسم کو ''حدیثُ النفس'' اور دوسری کو ''تسویلِ شیطانی'' کہا جاتا ہے۔ تیسری قسم جو صحیح اور حق ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک قسم کا الہام ہے جو اپنے بندے کو متنبہ کرنے یا خوشخبری دینے کے لیے کیا جاتا ہے' بایں معنی کہ اللہ تعالیٰ اپنے خزانۂ غیب سے بعض چیزیں اس کے قلب و دماغ میں ڈال دیتے ہیں۔

سچے خواب کے جزوِ نبوت ہونے کے بارے میں تفسیرِ مظہری میں ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نبوت کا سلسلہ تیئیس سال جاری رہا' ان میں سے پہلی ششماہی میں یہ وحی خوابوں کی



صورت میں آتی رہی' باقی پینتالیس ششماہیوں میں جبریل امین کی پیغام رسانی کی صورت میں آئی' اس حساب سے سچے خواب وحی نبوت کا چھیالیسواں جزو ہوئے۔ ایک حدیث میں ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مؤمن کا خواب ایک کلام ہے جس میں وہ اپنے ربّ سے شرفِ گفتگو حاصل کرتا ہے''۔ یہ حدیث طبرانی نے بسند صحیح روایت کی ہے۔

صرف وہ خواب صحیح طور پر الہام من اللہ اور حقیقت ثابتہ ہوں گے جو اللہ کی طرف سے ہوں اور اس میں کچھ عوارض بھی شامل نہ ہوئے ہوں۔ البتہ یہ بات یاد رکھیں کہ انبیاء علیہم السلام کے سب خواب ایسے ہی ہوتے ہیں' اس لیے کہ ان کے خواب بھی وحی کا درجہ رکھتے ہیں۔ جبکہ عام مسلمانوں کے خواب میں ہر طرح کا احتمال رہتا ہے' اس لیے وہ کسی کے لیے حجت اور دلیل نہیں ہوتے۔ انسان کے خوابوں میں بعض اوقات طبعی اور نفسانی صورتوں کی آمیزش ہو جاتی ہے اور بعض اوقات گناہوں کی ظلمت و کدورت صحیح خواب پر چھا کر اس کو ناقابلِ اعتبار بنا دیتی ہے۔ جب انسان اللہ سے لو لگاتا ہے اور اُس کا مقرب خاص بن جاتا ہے تو وہ اس عالَم میں کھلی آنکھوں اور اپنے ہوش و حواس میں اور بسا اوقات عالمِ خواب میں ایسے ایسے مشاہدات کرتا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے اور ان باتوں پر یقین کرنا مشکل ہوتا ہے اور نہ یقین کرتے ہوئے بھی بات نہیں بنتی۔

## تعبیرِ رؤیا' ایک افضل علم

تعبیرِ رؤیا ایک نہایت افضل علم ہے' اس کی فضیلت دلائلِ قرآنی سے ثابت ہے:

(۱) جس چیز کو اللہ تعالیٰ اپنے خاص انعامات میں شمار کرے' اس کے افضل ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس علم کو حضرت یوسف علیہ السلام کے انعامات میں شمار کیا ہے۔ فرمایا:

﴿وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۭ﴾

(یوسف : ۲۱)

''اور اسی طرح ہم نے یوسف کو اس ملک میں جگہ دی اور اس کو علمِ رؤیا سکھایا۔''

انعامِ الٰہی میں اس کا ذکر ہونا اس بات کی روشن دلیل ہے کہ علمِ رؤیا ایک نہایت افضل اور اعلیٰ علم ہے۔

(۲) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج شریف کے بعد خواب دیکھا کہ آپؐ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہمراہ عمرہ ادا کر رہے ہیں۔ اس خواب کی تصدیق خود باری تعالیٰ نے بایں الفاظ فرمائی:

﴿ لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ﴾ (الفتح:۲۷)

''تحقیق ہم نے اپنے رسول کا خواب سچ کر دکھایا۔''

جب باری تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کے خواب کی خود تصدیق فرمائی تو اس کے افضل ہونے میں کس کو کلام ہوسکتا ہے!

(۳) کسی بے گناہ کو جان بوجھ کر قتل کرنا ایک بدترین فعل اور گناہ کبیرہ ہے' جس کی سزا ہمیشہ کے لیے دوزخ ہے' جبکہ یہ بات مسلّم ہے کہ تمام پیغمبر گناہوں سے پاک ہوتے ہیں۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب میں دیکھا کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو ذبح کر رہے ہیں تو حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی رضامندی سے اس فعل کے لیے تیار ہوگئے۔ اس سلسلے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰٓاِبْرٰهِيْمُ ۝۱۰۴ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝۱۰۵ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ ۝۱۰۶ وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ۝۱۰۷﴾

(الصّٰفّٰت)

''اور ہم نے ان کو آواز دی کہ اے ابراہیم' بیشک تو نے خواب کو سچ کر دکھایا' بے شک ہم نیک لوگوں کو اسی طرح اجر دیا کرتے ہیں۔ حقیقت میں یہ بڑا امتحان تھا۔ اور ہم نے ایک بڑا ذبیحہ اس کے عوض دے دیا۔''

اگر خواب کوئی اعلیٰ چیز نہ ہوتی تو ابراہیم علیہ السلام محض خواب کی بنا پر اپنے لختِ جگر کو قربان کرنے کے لیے تیار نہ ہوتے اور اللہ تعالیٰ آپ کو امتحان میں کامیاب ہونے کی یہ بہترین سند عنایت نہ کرتا۔ اس سے خواب کی فضیلت روزِ روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے اور ساتھ ہی یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جس چیز میں اعلیٰ و افضل چیز کا تذکرہ ہو تو وہ علم (علم تعبیر) بھی اعلیٰ و افضل ہوتا ہے۔

## خواب کی تعبیر خواب پر موقوف ہونے کا مطلب

خواب کی تعبیر' خواب پر موقوف ہونے کا مطلب تفسیر مظہری میں یوں بیان ہوا ہے کہ بعض تقدیری امور' تقدیر مبرم یعنی قطعی نہیں ہوتے بلکہ معلّق ہوتے ہیں کہ فلاں کام ہوگیا (صدقہ دے دیا) تو یہ مصیبت ٹل جائے گی اور نہ ہوا تو پڑ جائے گی' جس کو قضائے معلّق کہا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں بُری تعبیر دینے سے معاملہ برا اور اچھی تعبیر دینے سے معاملہ اچھا ہوجاتا



ہے۔ اسی لیے علماء نے یہ اصول بیان کیا ہے کہ خواب اس کو نہ بتایا جائے جو عقلمند نہ ہو یا اس کا خیرخواہ نہ ہو۔ اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ بُری تعبیر سن کر انسان کے دل میں یہی خیال آتا رہتا ہے کہ اب مجھ پر مصیبت آنے والی ہے اور ایک حدیث قدسی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: أَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ یعنی بندہ میرے متعلق جیسا گمان کرتا ہے' میں اس کے حق میں ویسا ہی ہوجاتا ہوں۔

پس یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ خواب' اللہ تعالیٰ کے علم غیب کا حصہ ہیں' جو وہ اپنے پیغمبروں پر آشکارا کرتا ہے' اور تھوڑا سا اپنے نیک بندوں کو بھی عطا فرماتا ہے۔ یہ اللہ کی شان ہے کہ وہ اپنے اسرار سے جس بندے کو جب چاہے آگاہ کردے۔ البتہ اللہ تک رسائی کے لیے' اس کے مقربین میں شامل ہونے کے لیے' اس کی رضا پانے کے لیے تگ و دو کرنی پڑتی ہے' جس کا ذریعہ عباداتِ عمومی کے علاوہ عباداتِ خصوصی ہیں اور ان میں مراقبہ اور استخارہ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

## حواشی

(۱) صحیح البخاری' کتاب التعبیر' باب اذا رأی ما یکرہ فلا یخبر بھا ولا یذکرھا۔

(۲) سنن الترمذی' کتاب الرؤیا' باب قولہ لھم البشریٰ فی الحیاۃ الدنیا۔

(۳) صحیح البخاری' کتاب الطب' باب النفث فی الرقیۃ۔

(٤) صحیح مسلم' کتاب الصلاۃ' باب النھی عن قراءۃ القرآن فی الرکوع والسجود۔

(٥) صحیح البخاری' کاب بدء الوحی' وکتاب تفسیر القرآن وکتاب التعبیر۔ وصحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بدء الوحی الی رسول اللہ ﷺ۔

(٦) صحیح البخاری' کتاب التعبیر' باب رؤیا الصالحین ۔ وصحیح مسلم' کتاب الرؤیا۔

(۷) صحیح البخاری' کتاب التعبیر' باب المبشرات۔

(۸) کشف المحجوب' ابوالحسن سید علی بن عثمان ہجویری' ترجمہ عبدالرؤف فاروقی' ص ۱۱۔

❁❁❁

میثاق' حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔

# جادو اور آسیب کا علاج
## کتاب وسُنّت کی روشنی میں

حافظ محمد زبیر

جادو کرنا اور کروانا کفر ہے۔ ہمارے ہاں جادوگروں اور عاملوں کی اکثریت کفریہ اعمال واقوال کے ذریعے جادو کرتی ہے' لہٰذا ایسے جادوگر کی حد یہ ہے کہ اسے مرتد ہونے کی وجہ سے قتل کیا جائے۔ مادہ پرستی کے فروغ کی وجہ سے عوام الناس کی اکثریت ذاتی عداوت ودشمنی' میاں بیوی میں جدائی' ساس بہو کے جھگڑوں' کاروبار میں حسد ورقابت' محبوب کو قدموں میں لانے' بیوی کی طرف سے میاں کو مطیع وفرمانبردار کرنے' ہمسائے سے نجات حاصل کرنے اور زروزمین کی خاطر ایک دوسرے پر جادو کروایا جاتا ہے۔ قرآن اکیڈمی میں پچھلے ۶ سال کے دوران راقم نے محسوس کیا ہے کہ سائلین میں سے ۹۵ فی صد کی تعداد ایسی ہوتی ہے جنہیں جادو یا طلاق کا مسئلہ لاحق ہوتا ہے اور یوں لگتا ہے کہ جیسے اس دنیا میں لوگوں کے یہی دو مسائل اور پریشانیاں ہیں۔ بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی شخص پر کوئی جادو تو نہیں کرتا لیکن جِنّات اسے تنگ کرتے ہیں۔ جنات کے اس طرح تنگ کرنے کی مختلف وجوہات ہوتی ہیں' یا تو وہ اس گھر میں رہائش پذیر ہوتے ہیں جہاں انسان رہتا ہو اور وہ انسانوں کی بعض حرکات سے تنگ پڑتے ہیں اور پھر بدلہ لینے کے لیے تنگ کرتے ہیں' یا پھر انسان کسی ایسی جگہ بول وبراز کرتا ہے جو جنات کی رہائش گاہ ہوتی ہے اور وہ غصے میں اس انسان سے بدلہ لیتے ہیں۔ اس لیے انسانوں کو ہڈی' کوئلہ' گوبر اور درختوں وغیرہ کے نیچے پیشاب وپاخانہ سے اجتناب کرنا چاہیے۔

دوسری طرف گلی گلی عاملوں کی پیدائش نے جادوٹونے میں خطرناک حد تک اضافہ کر دیا ہے' اور اس سے زیادہ خوفناک بات یہ ہے کہ جادوٹونے میں مبتلا حضرات اپنے علاج کے لیے ایسے عاملین کی طرف رجوع کرتے ہیں جو سفلی وشیطانی علوم کے ذریعے جنات کو خوش کر کے جادو کا علاج کرتے ہیں' جو مصیبت پر مصیبت ہے اور علاج کے بجائے مرض میں اضافہ کا سبب بنتا ہے۔ ہمارے ہاں معاشرے میں ایسے عاملین نہ ہونے کے برابر ہیں جو محض کتاب وسنت



سے جادو اور تعویذ گنڈے کا علاج کرتے ہوں۔ ذیل میں ہم اس موضوع کی اہمیت کے پیش نظر جادو کا علاج کتاب وسنت کی روشنی میں بیان کر رہے ہیں۔ جس شخص کو جادو لاحق ہو وہ خود بھی یہ دم کر سکتا ہے اور کسی سے بھی کروا سکتا ہے' لیکن ان آیات وادعیہ ماثورہ میں اثر اسی قدر ہوگا جس قدر دَم کرنے والا شریعت پر عامل ہوگا۔ پس جادو کے علاج میں دم کرنے والے کا باعمل ہونا اور دوسرا پڑھائی یعنی کلامِ الٰہی کی تلاوت وادعیہ ماثورہ کی قراءت کی کثرت دو بنیادی عوامل ہیں۔ جو شخص جتنا زیادہ شریعت پر عمل کرنے والا ہوگا اور جس قدر پڑھائی کرنے والا ہوگا اس کے دم میں اسی قدر اثر ہوگا۔ جس شخص پر جادو ہوا ہو تو وہ درج ذیل آیات اور دعائیں صبح وشام پڑھ کر اپنے جسم اور پانی پر پھونکے اور اس پانی میں سے کچھ کو استعمال کرے اور کچھ سے غسل کر لے۔ ایسا عمل ۷ یا ۱۷ یا ۲۱ دن تک صبح وشام جاری رکھے۔ ان شاء اللہ' جادو کے اثرات زائل ہو جائیں گے۔ اگر کوئی شخص خود ان آیات اور ادعیہ ماثورہ کے ذریعہ علاج کرنے سے عاجز ہو تو کسی متقی وپرہیزگار عالم دین یا حافظ وقاری صاحب سے یہ علاج کروا سکتا ہے۔ اگر کسی عورت پر دم کرنا ہو تو اس کے محرم کی موجودگی میں اور اس کے لباس کو اچھی طرح لپیٹ کر دم کرنا چاہیے اور دورانِ دم غیر محرم اس کو ہاتھ وغیرہ نہ لگائے۔ علاوہ ازیں دم ایسی جگہ کیا جائے جہاں تصاویر اور خلافِ شریعت مظاہر مثلاً فلمیں یا آلاتِ موسیقی وغیرہ موجود نہ ہوں۔

## علاج کا طریق کار

عموماً جادو کروانے والا' جادو یا تعویذ گنڈا کروانے کے لیے کسی جادوگر یا عامل سے رابطہ کرتا ہے۔ اب جادوگر یا عامل نے پہلے سے کچھ چلّے کیے ہوتے ہیں جن میں اس نے کفریہ اقوال واعمال کے ذریعے شیطان کو خوش کیا ہوتا ہے تو شیطان جنّات کے سرداروں میں سے کسی سردار سے جادوگر کی ملاقات کروا دیتا ہے۔ جِنّات کا یہ سردار جادوگر کو اس کے کفریہ اقوال واعمال کے بدلے ایک خدمت گزار جن دے دیتا ہے اور جادوگر اس جن کو اس شخص کی طرف بھیجتا ہے جس کو جادو کے ذریعے تکلیف دینا مقصود ہوتا ہے۔ یہ جن غصہ یا شہوت یا ناپاکی کی حالت میں انسانی جسم میں داخل ہو جاتا ہے اور مختلف صورتوں میں انسان کو تکلیف اور اذیت پہنچاتا ہے۔ اس جن کے تکلیف کے اثرات زائل کرنے کا طریق کار درج ذیل ہے:

(۱) علاج کرنے والا باوضو ہو اور مریض کو دم کرنے سے پہلے اپنے اوپر آیۃ الکرسی' معوذتین' ۱۰ مرتبہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ اور اول وآخر درود ابراہیمی کا دم کرے۔ اور اگر مریض کے علاوہ

بچے یا کچھ اور لوگ اس جگہ موجود ہوں تو انہیں بھی احتیاطاً پھونک مارے۔

(۲) لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ سے دَم کی ابتدا کرے۔ اس کے بعد اَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ اور بِسْمِ اللّٰهِ الَّذِىْ لَا يَضُرُّ مَعَ اسْمِهٖ شَىْءٌ فِى الْاَرْضِ وَلَا فِى السَّمَاءِ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ تین تین مرتبہ پڑھے۔ اس کے بعد اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمُ مِنْ هَمْزِهٖ وَنَفْخِهٖ وَنَفْثِهٖ اور بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ پڑھے۔

اس کے بعد اپنا ہاتھ مریض کے سر پر رکھ کر درج ذیل آیات کی قرآن مجید پکڑ کر ترتیل کے ساتھ مریض کے کانوں کے قریب ذرا اونچی آواز کے ساتھ تلاوت کی جائے اور تلاوت کے دوران ان آیات کے معنی پر غور کیا جائے۔

(۳) سورۃ الفاتحہ (مکمل)

(۴) سورۃ البقرۃ کی آیات ۱ تا ۵

(۵) سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۰۲ (۷ مرتبہ)

(۶) سورۃ البقرۃ کی آیات ۱۶۳۔۱۶۴

(۷) آیت الکرسی

(۸) سورۃ البقرۃ کی آخری دو آیات

(۹) سورۂ آل عمران کی آیات ۱۸۔۱۹

(۱۰) سورۃ الاعراف کی آیات ۵۴ تا ۵۶

(۱۱) سورۃ الاعراف کی آیات ۱۱۷ تا ۱۲۲ (۷ مرتبہ' خوب خوش الحانی کے ساتھ)

(۱۲) سورۂ یونس کی آیات ۸۱۔۸۲ (۷ مرتبہ' خوب خوش الحانی کے ساتھ)

(۱۳) سورۂ طٰہٰ کی آیت ۶۹ (۷ مرتبہ' خوب خوش الحانی کے ساتھ)

(۱۴) سورۃ المؤمنون کی آخری ۴ آیات

(۱۵) سورۃ الصافات کی ابتدائی ۱۰ آیات (تین مرتبہ)

(۱۶) سورۃ الاحقاف کی آیات ۲۹ تا ۳۲

(۱۷) سورۃ الرحمٰن کی آیات ۳۳ تا ۳۶ (تین مرتبہ)

(۱۸) سورۃ الحشر کی آخری ۴ آیات

(۱۹) سورۃ الجن کی ابتدائی ۹ آیات



(۲۰) سورۃ الاخلاص' سورۃ الفلق اور سورۃ الناس (تین مرتبہ)

دَم کرنے والے کو چاہیے کہ وہ دم کرنے سے پہلے ان آیات کی تلاوت کو اپنا صبح وشام کا لازمی وظیفہ بنائے اور ان کی تلاوت کو کبھی بھی ترک نہ کرے تاکہ وہ جنات اور جادوگر کے ردّعمل اور جوابی غصے سے محفوظ رہے۔ اگر تو مریض پر جادو سخت ہو تو ایک عامی کو یہ علاج کسی ماہر سے مشورہ کرنے کے بعد کرنا چاہیے' کیونکہ دورانِ علاج مریض کی حالت بگڑ سکتی ہے اور جن اس کی زبان سے کلام کرنا شروع کر دیتا ہے۔ ایسے میں اس جن کو ہینڈل کرنا بھی ایک باقاعدہ فن ہے۔ بعض اوقات جبکہ جادو سخت نہ ہو تو دم کرنے سے مریض کی تکلیف مثلاً سر درد' پٹھوں میں درد وغیرہ بڑھ جاتا ہے' تو دم کرنے سے تکلیف دینے والے جن کی تکلیف بڑھ جاتی ہے جس وجہ سے وہ مریض پر دباؤ بڑھانا شروع کر دیتا ہے۔ اس صورت میں مریض پر تکلیف کے اثرات کو کم کرنے کے لیے آیۃ الکرسی اور درود شریف کا ورد کریں۔ بعض اوقات شریر جن دم کرنے والے شخص کو بھی متاثر یا اس پر حملہ کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کا علاج سورۂ صٓ کی شروع کی تین آیات ہیں۔ اگر مریض کا 'جن' دم کرنے والے پر اپنا کچھ اثر ڈالے تو دم کرنے والا ان آیات کی کثرت سے تلاوت کرے تو شریر جن کے اثرات زائل ہو جائیں گے۔ درج ذیل آیات دم کرنے سے مریض کو تکلیف پہنچانے والے جن کو بہت اذیت اٹھانی پڑتی ہے اور اس کے لیے ان آیات کا پڑھنا ایک طرح سے اسے جہنم میں جھونکنے کے مترادف ہے۔ یہ آیات کسی شریر اور ضدی جن کے اڑ جانے اور مریض سے نہ نکلنے اور اس کی جان نہ چھوڑنے پر اصرار کرنے پر پڑھی جاتی ہیں:

(۱) سورۃ الانفال آیات ۹ تا ۱۴ (معنی پر غور کرتے ہوئے بار بار پڑھیں' خاص طور پر فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ کے الفاظ)

(۲) سورۃ الحج آیات ۱۹ تا ۲۲ (بار بار پڑھیں)

(۳) سورۃ الدخان آیات ۴۳ تا ۵۰ (بار بار پڑھیں)

(۴) سورۃ الصافات کی ابتدائی ۱۰ آیات (بار بار پڑھیں)

(۵) مریض کے کان میں اونچی آواز سے اذان دینا' کیونکہ ایک صحیح روایت کے مطابق شیطان اذان کی آواز سن کر بھاگتا ہے۔

جادو ٹونے سے حفاظت کے لیے ضروری ہے کہ انسان ہر نماز کے بعد آیت الکرسی کی تلاوت کرے۔ صبح وشام سو مرتبہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ

وَهُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ کا ورد کرے۔ فجر اور مغرب کے بعد تین مرتبہ معوذتین کی تلاوت کرے اور مذکورہ بالا آیات کو اگر اپنا وظیفہ بنالے تو بہت ہی اچھا ہے۔ اپنے بچوں کو جنّات کے اثرات سے بچانے کے لیے یا ان سے اثراتِ بد دور کرنے کے لیے اُعِیْذُکَ بِکَلِمَاتِ اللّٰہِ التَّامَّۃِ مِنْ کُلِّ شَیْطَانٍ وَّھَامَّۃٍ وَمِنْ کُلِّ عَیْنٍ لَّامَّۃٍ اور بِسْمِ اللّٰہِ اَرْقِیْکَ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ یُّؤْذِیْکَ مِنْ شَرِّ کُلِّ نَفْسٍ اَوْ عَیْنِ حَاسِدٍ اللّٰہُ یَشْفِیْکَ بِسْمِ اللّٰہِ اَرْقِیْکَ والی دعائیں تین تین مرتبہ صبح وشام پڑھ کر پھونکے۔ سورۃ البقرۃ کی گھر میں تلاوت کرنا یا اس کا ریکارڈ لگانا بھی جادو سے حفاظت اور جادو ہو جانے کی صورت میں اس سے نجات کے لیے بہت مفید ہے۔ اگر جادو سخت ہو تو گھر میں روزانہ دن میں کم از کم تین مرتبہ نہایت بلند آواز کے ساتھ سورۃ البقرہ کی تلاوت لگانی چاہیے۔ اسی طرح اگر گھر والوں کی طرف سے سورۃ البقرۃ کی تلاوت بہت زیادہ کی جائے تو اس کا جادوگر اور جن پر بہت دباؤ پڑتا ہے اور بعض اوقات وہ معافیاں مانگنے پر بھی آجاتے ہیں اور سورۃ البقرۃ کی تلاوت ترک کرنے کی استدعا کرتے ہیں۔ اگر کسی شخص پر جادو نہ ہو اور اسے جنّات وغیرہ تنگ کر رہے ہوں اور اس شخص پر مرگی کے دورے پڑتے ہوں تو اس کے علاج کے لیے بھی یہی نسخہ ہے۔ درج بالا آیات اس پر بھی پڑھی جائیں اور اسے پانی پر دم کر کے پلایا جائے۔ اللہ تعالیٰ شفا نصیب فرمائے گا۔

جادو کے علاج کے بارے میں یہ مختصر سی تحریر افادۂ عام کے لیے مرتب کی گئی ہے۔ اس بارے میں مزید معلومات کے لیے کہ جادوگر جادو کیسے کرتا ہے' جادو کی کتنی قسمیں ہیں' مختلف قسم کے جادو کو جاننے کے لیے کیا علامات ہیں اور جادوگر جن سے کیسے کام لیتا ہے وغیرہ' کویت کے عالمِ دین شیخ وحید بن عبدالسلام بالی کی کتاب کا مطالعہ کریں۔ اس کتاب کا ترجمہ مختلف مکتبات نے کئی ناموں سے اردو زبان میں شائع کیا ہے۔ اس کتاب کا ایک ترجمہ 'جادو کا علاج قرآن وسنت کی روشنی میں' راقم کے پاس پی ڈی ایف فارمیٹ میں سافٹ کاپی میں موجود ہے۔ جن حضرات کو چاہیے ہو تو وہ درج ذیل ای میل پر رابطہ کر کے منگوا سکتے ہیں:

hmzubair2000@hotmail.com

اس کتاب کی ہارڈ کاپی ۹۹ جے بلاک' ماڈل ٹاؤن' لاہور سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ اسی جگہ ایک مستند عالمِ دین شیخ عبدالسلام کتاب وسنت کی روشنی میں جادو کے علاج کے لیے بھی بیٹھتے ہیں۔ فون نمبر درج ذیل ہے: 042-35852897;042-35866396




# دماغ آفروز

قوتِ حافظہ اور دماغ کے لیے زبردست اکسیر

دماغ آفروز — ایسے اصحاب کے لیے جو دماغی محنت کرتے ہوں، بہترین نعمت ہے۔
دماغ آفروز — دماغ کی خشکی، سر چکرانا، ذہنی ہیجان اور بے خوابی دور کرنے کی جادو اثر دوا ہے۔
دماغ آفروز — دماغ کی تمام قوتیں بحال کرتا ہے۔
دماغ آفروز — بھوک کو چمکا کر قوت ہاضمہ کو درست کر کے غذا کو جزو بدن بناتا ہے۔
دماغ آفروز — زندگی کے لیے کیمیا ہے، صحت کے لیے اکسیر ہے اور دماغ کے لیے نعمت ہے۔

- اگر آپ کی قوت حافظہ اور ذہن اچھی طرح کام نہیں کرتا تو بہترین شے جو آپ استعمال کر سکتے ہیں وہ.....دماغ افروز ہے۔
- اگر آپ عینک اتارنے کے خواہشمند ہیں تو یہی کورس 2 ماہ کیجیے!
- پڑھنے والے بچوں بالخصوص حفظ کرنے والے بچوں کے لیے خاص تحفہ!

حکیم حافظ سید محمد احمد۔ لاہور
0332-8477326
042-38477326



# خاورین (کورس)

اعصابی' جسمانی اور جوڑوں کے دردوں کی حیرت انگیز دوا

جوڑوں کا درد' لنگڑی کا درد' گھٹنوں اور کمر کا درد' اعصابی اور جسمانی دردیں' ورم' یورک ایسڈ کی زیادتی کا فوری اور مؤثر حل

100% ہربل

**نوٹ:** خاورین (کورس) کو ایک ماہ بلاناغہ استعمال کیجیے یقیناً آپ کو بہتر نتائج ملیں گے تو مزید کچھ عرصہ استعمال کر لیں۔ ہمیں پورا یقین ہے کہ آپ اس اذیت ناک مرض سے چھٹکارا حاصل کر لیں گے۔

مزید مشورہ کے لیے

حکیم حافظ سید محمد احمد۔ لاہور
0332-8477326
042-38477326

# مشاہیر (مکتوبات)

بنام

شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ و مولانا سمیع الحق مدظلہ

ترتیب وتالیف وحواشی

**مولانا سمیع الحق**

تقریباً پون صدی پر مشتمل اساطین علم ادب' علماء ومحدثین' مشائخ واکابرین امت' نامور اہل قلم شہسواران صحافت' دانشور ومصنفین' سیاسی زعماء حکمران وسلاطین کے مکتوبات نگارشات' تاثرات اور احساسات کا مجموعہ علمی' فقہی' مذہبی مسائل' ملکی تحریکات وبین الاقوامی سیاسی اتار چڑھاؤ اور عالم اسلام کو درپیش بحرانوں کے مدوجذر پر ارباب فکر ودانش کے خیالات وافکار کا ایک بڑا ذخیرہ مولانا سمیع الحق کے قلم سے ادبی تعارفی حواشی اور توضیحات مشاہیر کے خطوط کے عکسی نمونے

اکابر برصغیر پاک وہند بشمول بنگلہ دیش کے خطوط (پانچ جلدوں پر مشتمل)

مکمل سیٹ 7 جلدوں میں

جلد اول: ا تا ے بنام شیخ الحدیث مولانا عبدالحق" ...... صفحات (۷۰۲)

بنام مولانا سمیع الحق (حسب ذیل چھ جلدیں)

جلد دوم : ا ب پ ...... (۵۰۸) ★ جلد سوم : ت ٹ ث ج چ ح خ د ڈ ذ ر ز س ...... صفحات (۵۸۷)

جلد چہارم: ش ص ض ط ظ ع ......صفحات (۶۸۲) ★ جلد پنجم: غ ف ق ک گ ل م ن و ہ ے ......صفحات (۵۱۳)

جلد ششم : افغانستان (جہادی مشاہیر کے خطوط' جہادی رپورٹیں' شہداء' تحریک طالبان پر مشتمل تفصیلات گویا جہاد افغانستان اور جامعہ حقانیہ مستقل ایک جلد ...... (صفحات ۶۰۰ سے زائد)

جلد ہفتم: بیرونی ممالک ایران' عالم عرب' افریقہ' سنٹرل ایشیاء' فارایسٹ' امریکہ اور یورپی ممالک ...... (صفحات ۵۰۰ سے زائد)

نوٹ ...... مکتوب نگاروں کی ترتیب فرق مراتب کا لحاظ کئے بغیر حروف تہجی الف باء تا کے مطابق رکھی گئی ہے

| | | |
|---|---|---|
| صفحات 4500 سے زائد | قیمت مجموعہ (۷ جلد) **3500** روپے | رعایتی قیمت: **1800** روپے |

شائع کردہ : مؤتمر المصنفین دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک پاکستان





**ڈاکٹر رفیع الدین فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام**

ڈاکٹر محمد رفیع الدین (مرحوم) کی معروف کتاب

# قرآن اور علمِ جدید

کا ساتواں ایڈیشن شائع ہو کر منظر عام پر آ گیا ہے

## کتاب کا موضوع

''قرآن اور علم جدید'' ڈاکٹر صاحب کی ایک معرکۃ الآراء تصنیف ہے جو درحقیقت علامہ اقبال کی کتاب ''خطبات'' ہی کے سلسلے کی ایک دوسری کامیاب کاوش ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے ناقابل تردید حقائق، دلائل اور مثالوں سے ان تمام فلسفوں اور نظریات کے تار و پود بکھیر دیئے ہیں جن کی بنیاد پر آج تک مختلف ممالک میں نظام ہائے حکومت قائم رہے ہیں۔

☆ عمدہ طباعت ☆ خوبصورت ٹائٹل کور ☆ اعلیٰ جلد بندی

☆ 583 صفحات ☆ قیمت 650 روپے

ڈاکٹر محمد رفیع الدین (مرحوم) کی درج ذیل تصانیف بھی دستیاب ہیں:

(1) Ideology of the Future — Price: Rs.500/-

(2) The Quran & Modern Knowledge — Price: Rs.500/-

(قرآن اور علم جدید کا انگریزی ترجمہ)

ہول سیلرز، پبلشرز اور بک سیلرز کے لیے خصوصی تعارفی قیمت

ملنے کا پتہ: **ڈاکٹر رفیع الدین فاؤنڈیشن**

36-K، ماڈل ٹاؤن، لاہور، فون: 042-35074598

ڈسٹری بیوٹر: پروگریسو بکس، اردو بازار، لاہور، فون: 042-37352795

تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے (حدیث)

رمضان المبارک کے موقع پر مکتبہ خدّام القرآن لاہور کی خصوصی پیشکش

# بیان القرآن CDs

2-CDs میں قرآن مجید کا مکمل ترجمہ اور مختصر تشریح

MP3

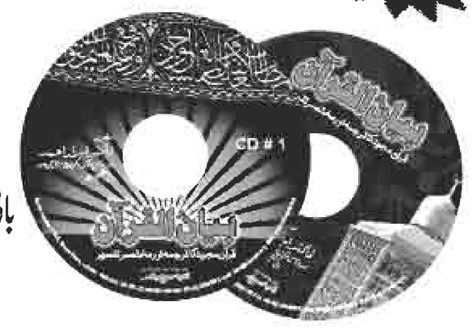

مقرر:

## ڈاکٹر اسرار احمد

بانی تنظیم اسلامی و صدر مؤسس مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور



رمضان المبارک اور عید الفطر کے موقع پر "اپنوں" کو

## بیان القرآن CDs

کا بہترین تحفہ دیجئے

صرف 30 روپے میں

لاہور کے لیے کوریئر چارجز 40 روپے (کل 70 روپے فی سیٹ ارسال کریں)
بیرون لاہور کے لیے کوریئر چارجز 70 روپے (کل 100 روپے فی سیٹ ارسال کریں)

نوٹ: یہ پیشکش صرف عید الفطر تک ہے (اسٹاک محدود ہے)

**مکتبہ خُدّام القُرآن** قرآن اکیڈمی، K-36 ماڈل ٹاؤن لاہور

فون: 3-35869501 (42-92) ای میل: maktaba@tanzeem.org





# انجمن خُدّام القرآن (قرآن اکیڈمی) سندھ کراچی

کے تحت

داعیٔ قرآن ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کے جاری کردہ

# قرآن فہمی کورس پارٹ I اور II

## میں سال 12-2011ء کے لیے داخلوں کا اعلان

جدید تعلیم یافتہ حضرات و خواتین کے لیے علومِ دینیہ کی تحصیل کا نادر موقع!

**پارٹ I**

| | |
|---|---|
| • علم تجوید | • دورۂ ترجمہ قرآن |
| • آسان عربی گرامر | • مطالعۂ حدیث |
| • مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب | • عقائد و عبادات |
| • ترجمۂ قرآن حکیم | • اسپیشل لیکچرز |
| • سیرت النبی ﷺ | • کلام اقبال |

**پارٹ II**

| | |
|---|---|
| • علم تفسیر | • اصول فقہ |
| • علم حدیث | • عقیدہ |
| • علم فقہ | • عربی زبان و ادب |
| • اصول تفسیر | • تحریکات |
| • اصول حدیث | • اضافی محاضرات |

- پارٹ I اور پارٹ II دونوں ایک ایک سال کے دورانیے پر مبنی ہیں
- پارٹ I میں داخلے کے لئے انٹرمیڈیٹ یا مساوی سند درکار ہوگی
- آغاز: 19 ستمبر 2011ء
- پارٹ II میں داخلے کے لئے پارٹ I یا مساوی سند لازمی ہے
- خواتین کے لئے شریعت کے مطابق باپردہ اہتمام
- اہل طلبہ کے لئے مناسب اسکالرشپ
- شہر کے باہر سے آنے والے طلبہ کے لئے محدود تعداد میں ہاسٹل اور میس کی سہولت موجود ہے

نوٹ: ہاسٹل/میس کی سہولت قرآن اکیڈمی یاسین آباد میں صرف حضرات کے لئے دستیاب ہے۔ اسی طرح فی الوقت پارٹ II کا کورس بھی صرف حضرات کے لئے یاسین آباد اکیڈمی میں منعقد کیا جا رہا ہے۔

**مقاماتِ تدریس:**

1. قرآن اکیڈمی ڈیفنس، مسجد جامع القرآن خیابان راحت فیز 6 درخشاں ڈیفنس، کراچی 23-021-35740022
2. قرآن اکیڈمی یاسین آباد، شارع قرآن اکیڈمی، بلاک 9، فیڈرل بی ایریا، کراچی 021-36806561
3. قرآن مرکز گلستان جوہر، مسجد باب القرآن، سالکین بسیرا، بلاک 14 کراچی 021-34255995

مزید تفصیلات، پراسپیکٹس اور داخلہ فارم ویب سائٹ سے حاصل کریں www.quranacademy.com

داعیٔ رجوع الی القرآن، بانیٔ تنظیم اسلامی

محترم **ڈاکٹر اسرار احمد** رحمۃ اللہ علیہ

کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن

پر مشتمل

# بیانُ القرآن

## ترجمہ و مختصر تفسیر

**حصّہ اول** سُورۃ الفاتحہ وسُورۃ البقرۃ مع تعارفِ قرآن

صفحات: 360، قیمت 450 روپے (پانچواں ایڈیشن)

**حصّہ دوم** سُورۃ آلِ عمران تا سُورۃ المائدہ

صفحات 321، قیمت 400 روپے

**حصّہ سوم** سُورۃ الانعام تا سُورۃ التوبہ

صفحات 331، قیمت 400 روپے

عمدہ طباعت ❁ دیدہ زیب ٹائٹل اور مضبوط جلد ❁ امپورٹڈ پیپر

ملنے کے پتے

**انجمن خُدّام القرآن خیبر پختونخوا، پشاور**

A-18 ناصر مینشن، ریلوے روڈ نمبر 2، شعبہ بازار پشاور، فون: 2584824,2214495(091)

**مکتبہ خُدّام القرآن لاہور**

K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)

---

داخلے جاری ہیں

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام

# رجوع الی القرآن کورسز (پارٹ I اور II)

یہ کورسز بنیادی طور پر تعلیم یافتہ افراد کے لیے ترتیب دیے گئے ہیں، تاکہ وہ حضرات جو کم از کم انٹرمیڈیٹ کی سطح تک اپنی دنیاوی تعلیم مکمل کر چکے ہوں اور اب بنیادی دینی تعلیم بالخصوص عربی زبان سیکھ کر فہم قرآن کے حصول کے خواہش مند ہوں، ان کورسز کے ذریعے ان کو ایک ٹھوس بنیاد فراہم کر دی جائے۔ ہفتے میں پانچ دن روزانہ صبح کے اوقات میں تقریباً پانچ گھنٹے تدریس ہوگی۔ ہفتہ وار تعطیل ہفتہ اور اتوار کو ہوگی۔

### نصاب (پارٹ I)

1. عربی صرف ونحو
2. ترجمۂ قرآن
3. آیاتِ قرآنی کی صرفی ونحوی تحلیل
4. قرآن حکیم کی فکری وعملی راہنمائی
5. تجوید و ناظرہ
6. مطالعۂ حدیث و فقہ العبادات
7. اصطلاحاتِ حدیث
8. اضافی محاضرات

### نصاب (پارٹ II)

1. مکمل ترجمۃ القرآن (مع تفسیری توضیحات)
2. مجموعۂ حدیث
3. فقہ
4. اصولِ تفسیر
5. اصولِ حدیث
6. اصولِ فقہ
7. عقیدہ
8. عربی زبان وادب
9. اضافی محاضرات

- اس سال کلاسز کا آغاز 12 ستمبر سے ہوگا
- داخلہ کے خواہشمند خواتین وحضرات 12 ستمبر کو صبح ساڑھے آٹھ بجے انٹرویو کے لیے قرآن اکیڈمی تشریف لائیں
- پارٹ II میں خواتین کی شرکت کا انتظام نہیں ہے

**نوٹ:**

پارٹ I میں داخلے کے لیے انٹرمیڈیٹ پاس ہونا اور پارٹ II میں داخلے کے لیے رجوع الی القرآن کورس (پارٹ I) پاس کرنا لازمی ہے

---

برائے رابطہ: **قرآن اکیڈمی**

K-36 ماڈل ٹاؤن لاہور

فون: 3-35869501

email:irts@tanzeem.org

**ندیم سہیل**

0322-4371473

0312-4140589